سہ ماہی

قلم قرطاس

شعبہ اُردو جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد

شمارہ نمبر 3 (اپریل تا جون 2015) جلد 1

ہماری دعوت

- طلبہ میں کتاب دوستی کے کلچر کو فروغ دینا۔
- طلبہ تک فرقہ واریت کی تفریق سے بالاتر ہو کر اپنی دعوت پہنچانا ان کو علم حاصل کرنے کی طرف راغب کرنا اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا احساس طلبہ میں بیدار کرنا۔
- ادبی و علمی محافل کا اہتمام کرنا۔
- جو طلبہ لکھنے کی کوشش کر رہے ہو ان کی راہنمائی اور ان کو منظم کرنا۔
- جو طلبہ قلم قرطاس ادبی مجلس کے نظم میں منسلک ہو جائیں ان کے لیے اسلام اور جدید علوم کے وسیع مطالعہ، سیرت و کردار کی تعمیر اور خداداد صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما کرنا۔
- معاشرے میں طبقاتی کشمکش اور سیاسی استحصال سے پاک معاشرے کے قیام کی قلم اور قرطاس کے ذریعے جدوجہد کرنا۔

قلم قرطاس ادبی مجلس

شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد

طلبا و طالبات کی علمی و ادبی کاوش
سہ ماہی
قلم قرطاس
شعبہ اُردو جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد
شمارہ نمبر 3 (اپریل تا جون 2015) جلد 1
مدیر
حافظ محمد حیات
ناصر علی وارثی
نائب مدیر
عائشہ مشعل
ناظم مالیات
مہوش نواز ـــ اظہار الحق
زرِ تعاون فی خرچہ
50 روپے
نگران اعزازی
ڈاکٹر محمد آصف اعوان
ڈاکٹر طارق ہاشمی
ڈاکٹر اصغر علی بلوچ
مجلسِ مشاورت
ڈاکٹر شبیر احمد قادری
ڈاکٹر محمد ارشد اویسی
ڈاکٹر پروین اختر کلّو
ڈاکٹر رابعہ سرفراز
ڈاکٹر سعید احمد
ڈاکٹر ظفر حسین ہرل
ڈاکٹر میمونہ سبحانی
پروفیسر ماجد مشتاق
پروفیسر حافظ عبدالعزیز
پروفیسر صائمہ اقبال
منتظمین
طارق ندیم واہگہ
حافظ محمد آصف شہزاد
محمد عثمان حفیظ
محمد صفدر اعوان

پتہ برائے خط و کتابت
ڈاکٹر طارق ہاشمی 0345-9384252
شعبہ اُردو جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد
ناصر علی وارثی 0334-9614796
حافظ محمد حیات 0332-6566713

حسنِ ترتیب

اداریہ

مطلب یہ ہے کہ ادیب کا کام صرف اور صرف لکھنا ہے۔ وہ اپنے قلم سے اپنے افکار و نظریات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔اس کی تحریر میں جتنی شائستگی، حُسن آفرینی، تخیل اور مہذب پن ہوگا وہ اس قدر اچھا ادیب گردانا جائے گا۔ وہ اپنے گفتہ اور شائستہ الفاظ کی مدد سے اپنا خیال، تفکر اور نظریہ دوسروں تک پہنچا سکے گا، اس کے پاس صرف اور صرف قلم کی طاقت ہے اور وہ اگر اس سے بھرپور ہے تو اسے کسی دوسری شے اور طاقت کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ خود کو مردِ تنِ آساں نہ سمجھے۔ وہ تو عقدہ کُشا ہے۔ وہ راہ نما ہے۔اس کی نظر حکیمانہ ہے۔اور اس کا طریق قلندرانہ ہے۔ پھر وہ زمانہ ستیز ہو جاتا ہے۔نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو ہو کر سچ کو سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنا اپنا شعار بنا لیتا ہے۔تب زمانہ اسے ادیب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

چہ باید مرد را طبعِ بلندے ، مشربِ نالے
دلِ گرمے ، نگاہِ پاک بینے ، جانِ بے تابے

ادیب کا بس یہی کام ہے کہ وہ اپنے قلم کو جنبش دے۔سائنس دان تجربہ کی رو سے اپنے نظریہ کو ثابت کرتا ہے۔ریاضی دان فارمولا استعمال کرتا ہے۔ایک فنکار اپنے فن سے اپنا نظریہ دوسروں تک پہنچاتا ہے۔مگر ادیب اپنی تحریر سے معاشرے میں جان پیدا کرتا ہے۔وہ ادبی پیرائے استعمال کرتا ہے اور معاشرے میں اپنی سوچ کے دھارے کھولتا ہے۔

ایک اچھا ادیب کسی سوچ اور نظریے کے دباؤ کے بغیر لکھتا ہے۔اس کا ذہن کسی خاص تحریک سے عاری ہوتا ہے۔وہ صرف معاشرے کو دیکھتا ہے،تفکر کو اپناتا ہے،نگاہ میں حیا لاتا ہے،اپنے الفاظ کو چنتا ہے اور پھر وہ رہنما بنتا ہے۔جس کی آج معاشرے میں بے انتہا ضرورت ہے۔

نئے لکھنے والے دوست انہی چیزوں کو اپنا کر ایک اچھے ادیب اور معاشرہ ساز بن سکتے ہیں۔نہ کہ پہلے ہی دن سے کسی کج روی سوچ،نظریات اور تحریک کے زیرِ سایہ لکھنا شروع کریں۔ایک اچھا ادیب معاشرے کو اپنی تحریر سے جلا بخشتا ہے نہ کہ وہ فتنہ ساز اور رنگ باز بن کر معاشرتی برائیوں کی بنیاد بنے۔ایک معاشرتی ہونے کے ناطے ہمارا اوّلین فریضہ یہی ہونا چاہیے کہ ہم نے معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

آصف شہزاد

نعت

سفینے کو میرے کنارے ملے گا
مجھے حاضری کا اشارا ملے گا

نہ کوئی رہے گا اسے غم جہاں کا
جسے مصطفیٰ کا سہارا ملے گا

یہ دہلیز زہرا کرم ہی کرم ہے
جو مانگیں گے سائل وہ سارا ملے گا

شبِ اسریٰ موسیٰ بڑے منتظر تھے
کہ اب مصطفیٰ کا نظارا ملے گا

پڑے گی نگہ جب رخِ مصطفیٰ پر
تلاوت کو قرآن کا پارہ ملے گا

سکندر نصیبوں کا سمجھوں گا خود کو
مجھے سنگِ در جب تمہارا ملے گا

کرم ان کا آصف ہوا تو یقیناً
شرف حاضری کا دوبالا ملے گا

مضامین

تہلیل الرحمٰن	شہباز احمد
بینش شہزادی	حافظ لیاقت علی
محمد ناصر	عائشہ مشعل
اظہار الحق	طارق ندیم
حافظہ نورین فاطمہ	

انسانِ کامل درنظرِ اقبال

اقبال کی علمی توجہ، تحقیق اور تعبیر کا بنیادی موضوع انسان ہے۔کلامِ اقبال میں انسان کے موضوع پر بہت کچھ کہا بلکہ یوں سمجھیے کہ کلامِ اقبال کا کل موضوع ہی انسان ہے۔ اقبال خدا کی بات بھی انسان ہی کے حوالے سے کرتے ہیں۔اقبال کے نظامِ فلسفہ کے اساسی عناصر یعنی خودی اور بے خودی انسان کی حیثیت، دائرہ کار، اختیار اور علم، عمل اور ارادے کی حدود اور ان کے ہمہ پہلو نتائج سے متعلق نوع بنوع مباحث کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔علامہ اقبال کی فکر کو انسان شناسی کا ایک بہت بڑا منبع کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی خدا شناسی بھی انسان شناسی ہے۔کلیات اُردو کی آخری نظم (ارمغانِ حجاز اُردو) کا عنوان ''حضرتِ انسان'' ہے اور یہ معنی خیز نظم اس سوال پر تمام ہوتی ہے کہ:

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
میرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے؟

شعر سوال کے لیے ایک موزوں میڈیم ہے۔شعر میں دیا گیا ''جواب'' بھی معنی و

مفہوم اور تعبیر وتشریح کے اعتبار سے دیگر کئی سوال اپنے اندر رکھتا ہے۔ اقبال کا نظامِ فکر اس شعر میں اٹھائے گئے سوال کا مفصل جواب دیتا ہے۔ یہ انسان اور انسان کے حوالے سے کائنات اور ان دونوں حوالوں اور مثالوں کی مدد سے خدا کو سمجھنے کی ایک کوشش ہی تو ہے۔ اقبال کی تمام تصانیف کا مشترکہ موضوع اگر تلاش کرنا ہو تو وہ انسان ہی ہوگا۔ انسان کی حقیقت اور صلاحیت کیا ہے؟ عالم فطرت میں اس کا کیا مقام ہے؟ اور اسی اعتبار سے اس کی ہستی کے مقاصد کیا ہیں؟ اسی قسم کے کئی سوالات جو انسان کی مجبور اور مختار، کمتر اور برتر، ذلیل اور عظیم اور مغلوب و غالب کے درمیان گھماتے پھراتے رہے۔ مباحث ونظریات کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ بنیادی طور پر سب کی کوشش یہی رہی کہ کسی طرح انسان مصائب و مشکلات سے نجات پا کر امن وآتشی کی زندگی گزار سکے۔

اقبال کے ہاں بعض شخصیتیں ایسی بھی ہیں جن کی مثالیت کامل نہیں بلکہ کسی ایک وصف خاص میں نمایاں ہے اور یہ سیاق وسباق سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اقبال کے پسندیدہ انسان کی جھلک ان کی کتابوں میں بکھری ہوئی صورت میں جابجا نظر آتی ہے۔ لیکن یکجا مربوط تصویریں بھی موجود ہیں۔ مثلاً ''اسرارِ خودی'' میں خودی کی ترتیب کے ضمن میں عشق و محبت کی اہمیت کے بد اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریوں کی صلاحیت مثلاً ذکر وفکر اور فقر غیور وغیرہ کا ذکر کر کے ان دوسروے خصائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اقبال کے پسندیدہ انسان کے لیے ضروری ہے۔ پھر ان عیوب کا بھی ذکر کیا ہے جو پسندیدہ انسان کو اپنے سے گرا دیتے ہیں۔ مثلاً حرص، خوف، غم اور وسواس اس کے علاوہ احتیاج جو انسان کو سوال کرنے پر مجبور کر دے۔

اقبال کے پسندیدہ انسان کے اوصاف کا ایک موقع ''جاوید نامہ'' میں زیرِ عنوان ''خطاب بہ جاوید'' بھی ملتا ہے اور اس کی تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ سب سے پہلے ایک نوجوان کے دل میں سوز لا اِلٰہ اِلا اللہ پیدا ہونا لازمی ہے۔ پھر علم حق کی طرف توجہ ضروری

ہے۔ کیونکہ علم حواس ناقص ہے پھر اخلاقی و روحانی تربیت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو کم سے کم کرے اور کہا ہے کہ:

کم خود و کم خواب و کم گفتار باش

پھر کہا ہے کہ اخلاص مند ہو، خوف سلطان و امیر سے پاک ہو، مہر و رضا میں عدل کا راستہ فقر و رعنا میں توازن پیدا ہو، حفظ روح کے لیے ذکر و فکر ہے حساب لازمی ہے اور حفظ تن کے لیے ''ضبطِ نفس'' لابدی زندگی چونکہ لذت پرواز کا نام ہے۔ اس لیے اعلیٰ نصب العین کے لیے جدوجہد ناگزیر ہے، مگر رزق کے لیے گراوٹ حرام ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:

سر دین صدق مقال

خلوت و جلوت تماشائے جمال

عظمت انسانی پر اقبال کی اعتقاد اس قدر پختہ ہے کہ وہ قدیم قصص میں بیان کردہ انسان کے کردار سے کہ جس کے مطابق انسان کو ماحول کے سامنے بے بسی اور اسی لیے اس کو مجبور، دکھی اور ناکافی صلاحیت والا بتایا جاتا تھا، مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ کسی ایسی بات پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوتے جس سے انسان کی کسی بھی سطح پر تذلیل کا پہلو نکلتا ہو، بایں ہمہ یہی وجہ ہے کہ وہ ہبوطِ آدم کے قصے کی قرآنی صورت کو بے حد اہمیت دیتے ہوئے اس کی مثبت توضیح کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اس طرح وہ اس قدیم تصور کی نفی اخذ کرتے ہیں جس کے مطابق انسان کو کسی گناہ کی پاداش میں سزا کے طور پر زمین پر محبوس کیا گیا ہو کیونکہ ایسا عقیدہ زمین پر وقوع پذیر ہونے والے سارے احوال و واقعات کو سزا کے ساتھ منسوب کر کے انسانی عظمت کی بجائے انسانی بے بسی اور لاچاریت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اسی لیے اقبال ان قدیم تصورات سے منہ موڑ کر ہماری توجہ اس قصے کی قرآنی صورت کی طرف مبذول کرتے ہیں اور ایسی توضیحات پیش کرتے ہیں جو انسانی فضیلت پر منتج ہوتی ہوں۔

انسان کے اعمال و افعال متعین نہیں، اسے اختیار دیا گیا ہے۔ اس نفس متناہیہ

کے سامنے خیر اور شر، دونوں راستے موجود ہیں۔ اسے اختیار ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ من حیث المجموع اقبال فکر اسلامی کو بنیاد بنا کر انسان کو ایک ایسی تخلیق کی صورت میں سامنے لاتے ہیں جسے اس کے خالق نے بہترین طریقے سے پیدا کر کے عمل و اختیار کے تمام تر امکانات عطا فرما دیے۔ یہاں پیامِ مشرق کی نظم محاورہ مابین خدا و انسان کے مطالب پر توجہ مناسب رہے گی کہ جس میں اقبال انسان کے مقام و مرتبے کی نوعیت کو نہایت دلچسپ اور احسن طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ یہاں اللہ انسان سے کہتا ہے:

جہاں راز یک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

اب انسان کا جواب سنیے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم از زہر نوشینہ سازم

انسان کا یہ اعتماد اس کی ذات کے جملہ امکانات کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عمل اور تحرک کے تمام تر امکانات کا حامل انسان زمین پر کسی سزا کے

واسطے نہیں بلکہ نیابت حق کے لیے بھیجا گیا ہے۔

اقبال انسان کی تمام تر صلاحیتوں اور مخفی امکانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل پیش کرتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر انسان درجہ کمال کو پہنچ سکتا ہے اور یہ لائحہ عمل ''اسرارِ خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کی شکل میں پیش ہوا ہے۔ اسے اقبال کا فلسفہ خودی و بے خودی بھی کہا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کے تین مراحل ہیں۔ مرحلہ اوّل اطاعت، مرحلہ دوم ضبطِ نفس، مرحلہ سوم نیابتِ الٰہی۔ اقبال کے نزدیک جو انسان ان تین مراحل کو طے کرے وہی اقبال کی نظر میں انسانی عظمت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے اور اسے اقبال کبھی بندہ مومن کہتے ہیں اور کبھی مردِ مومن۔ اسی طرح مردِ بزرگ، صاحبِ امروز، مومنِ جانباز، صاحبِ لولاک، مردِ حق، مردِ آفاقی اور مختصر یہ کہ مرد مسلمان! ضربِ کلیم میں اقبال اس مردِ مسلمان کی یہ عظمت اور شان بیان کرتے ہیں:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
قہاری و غناری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

اسی مردِ کامل یا مومن کی صفات اقبال بالِ جبریل میں بھی بیان کرتے ہیں اور اپنی اس نظم میں ''کافر مسلمان'' سے مراد بے مسلمان کی ہے جو صرف مسلمان کے گھر پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان ہے لیکن اس کے طور طریقے کافروں سے مختلف نہیں۔ کامل اور پکے مسلمان کے لیے اقبال مومن کا لفظ استعمال کرتے ہیں:

کافر ہے مسلماں، تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

اقبال نے اپنے زمانے تک کے سب تصورات کے ادھورے پن کا احساس

کرتے ہوئے ہمیں نئے انسان کا تصور دیا ہے جو مغربی معاشرے کی ابتری کا علاج بھی کر سکتا ہے اور اپنی آرزوؤں کی بھی ایک دنیائے نو تعمیر کر سکتا ہے۔ اقبال کے پسندیدہ انسان کے بہت سے خط و خال قرآن مجید میں بھی موجود ہیں اور اقبال نے اسلامی اخلاق کو مدنظر رکھتے ہوئے بنیاد رکھی۔ اقبال کے معاشرے کا ہر فرد کامل انسان نہ بھی ہو مگر ہر فرد کو بہتر سے بہتر انسان بن جانے کی آرزو کرنے میں کیا برائی ہے اور سچ یہ ہے کہ ہمیں موجود عہد میں ایسے انسانوں کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہے۔

قلم قرطاس ادبی مجلس، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے رکن **محمد آصف شہزاد** نے آل پاکستان یونیورسٹیز میں مقابلہ مضمون نویسی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

منجانب:

قلم قرطاس ادبی مجلس

شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

انقلاب کا علمبردار فیض

سیالکوٹ، پنجاب کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اُردو کے دو بڑے شاعر اقبالؔ اور فیضؔ پیدا کیے۔ جنہوں نے اپنے افکار و خیالات سے اُردو شاعری کو رعنائی و توانائی، گہرائی و گیرائی، وسعت و جامعیت اور افادیت و آفاقیت عطا کی۔ انہوں نے اپنے سوز دروں، اپنی ژرف نگاہی اور اپنی اعلیٰ تخیل کو اشعار کے سانچے میں ڈھال کر فکر و فن اور گفتار و کردار کا ایسا مینارہ نور تعمیر کیا جس نے اُردو شاعری کو تاریک راہوں پر چلنے سے بچا لیا۔ علامہ اقبال نے تہذیب فرنگ کو بے نقاب کیا۔ خودی و خود اعتمادی، بلند ہمتی اور عزتِ نفس کے جذبات بیدار کیے اور شاعری کے مردہ جسم میں تازہ روح پھونکی، اس کو زندہ، متحرک اور اولوالعزم بنایا۔ فیض نے جب ہوش سنبھالا تو اقبال کے حیات بخش اور حیرت نواز نغمتوں سے فضا گونج رہی تھی۔ بانگِ درا نے خضرِ راہ بن کر گم کردہ راہوں کو منزلِ مقصود کا راستہ دکھایا تھا۔ کارواں کے دل میں احساسِ زیاں پیدا کرنے کے لیے ضربِ کلیم نے معجز نمائی کی۔ بالِ جبریل نے:

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔''

کا یقین دلا کر نئے نئے جہاں تلاش کرنے کا ذوق وشوق عطا کیا اور ارمغانِ حجاز نے آزاد و محکوم کا فرق بتایا ہے کہ:

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دل روشن نفس گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک

فیض بھی اس نوائے حریت وانقلاب سے متاثر ہوئے۔ اقبال کے گیتوں کے دل ودماغ کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ان کو بصیرت و بصارت بھی عطا کی۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں:

چند نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خبر
یا شمع بزم صبح کی آمد سے بے نیاز

علامہ اقبال کا انتقال ۲۱ر اپریل کو ہوا تھا۔ اس شاہ گداز کے چلے جانے کے بعد دیس کی راہیں پھر سے اُداس ہوگئیں۔ فیض اپنی عمر کی ۲۶، ۲۷ منزلیں طے کر کے عربی اور انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد معلموں کی صف میں شامل ہو چکے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی وہ وطن کے شیدائی تھے۔ حساس طبیعت اور گداز دل، گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوتا، یہ تاثر جب کرب واضطراب کی شکل اختیار کر لیتا تو اشعار کی صورت میں ظاہر ہو جاتا۔ ''زندہ دلانِ پنجاب'' کے حلقے میں وہ پہلے ہی شامل ہو چکے تھے۔ ایم اے او کالج امرتسر میں جب وہ انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے تو ادبی سرگرمیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ کالج

کے پرنسپل صاحبزادہ محمود الظفر تھے جو بڑے روشن خیال اور ترقی پسند تھے۔فیض ان سے کافی متاثر ہوئے۔۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنّفین کی بنیاد پڑی اس میں بھی فیض نے اہم حصہ لیا۔

اس طرح وہ حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ قوتِ عمل کی بھرپور ترجمانی کرنے لگے تھے۔ان کا پہلا مجموعہ کلام ''نقشِ فریادی'' علامہ اقبال کی موت کے کچھ عرصہ بعد شائع ہوااور دیس کی راہیں جو اُداس ہوگئی تھیں وہ پھر سیالکوٹ کے اس دوسرے فرزند نے روشن کر دیں۔یہ زمانہ ہندوستان کے لیے بڑا سخت زمانہ تھا۔قومی حکومتیں مستعفی ہوچکی تھیں۔آزادی کے پروانوں کونظر بند کیا جا رہا تھا۔ برطانوی حکومت اپنی مہذب نما بربریت اور عدل نما ہلاکت خیزیوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔جیل کی آہنی سلاخیں، مادرِ ہند کے سپوتوں کا استقبال کر رہی تھی۔سجاد ظہیراسی جرم حریت کی وجہ سے سنٹرل جیل لکھنؤ میں حکومت برطانیہ کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے رکھے گئے۔فیض احمد فیض بھی ان دنوں جیل میں تھے اور اپنا کلام ''نقش فریادی'' کے نام سے شائع کیا۔

فیض کا نام اور کلام، ادب سے دلچسپی رکھنے والوں خصوصاً حریت پسند حضرات کے لیے ایک عجیب کشش رکھتا تھا۔ یہ خبر بڑی حسرت خیز تھی۔ چنانچہ ''نقشِ فریادی'' حاصل کر کے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھا گیا۔اسی وقت یہ تسلیم کرنا پڑا کہ فیض نے اردو شاعری کے روایات میں ایک نئی اور جاندار روایت قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس میں قدیم حسن اپنی اپنی پاکیزہ رعنائی وزیبائی کے ساتھ جلوہ گر ہےاور ترقی پسندی کی روایات بھی اپنی محشر سامانیوں اور عشوہ طرازیوں کے ساتھ موجود ہیں۔لیکن نہ تو ان میں عریانیت کا رجحان ہےاور نہ جنسیات کا ہیجان خیز بیان۔اس میں ''آبروئے شیوہ اہلِ نظر'' کا ہر لفظ میں خیال رکھا گیا ہےاور اپنے خونِ جگر سےفن کا اعجاز وکمال ظاہر کیا گیا ہے۔بیس یا تیس برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود ''نقشِ فریادی'' کے یہ اشعار دل پر اب تک نقش ہیں:

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج

اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج
ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کام نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا
عرصہ دھر کے ہنگامے، تہِ خواب سہی
گرم رکھ کر آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

یہ اور اسی قسم کے بہت سے اشعار جو اس وقت یاد ہو گئے اور اب تک یاد ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ انگریزی کی سیاست نے ہر محبّ وطن کے دل کو شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا۔ اس وقت سب سے بڑی تمنا ہی یہ تھی کہ یہ دورِ غلامی، یہ ظلم وستم کی حکومت جلد ختم ہو۔ ہندوستان آزاد ہو کر جنت کا نشانہ بنے۔ اس زمانہ میں کبھی کبھی بچوں کے لیے بھی ٹوٹی پھوٹی نظمیں لکھا کرتا تھا۔ ان میں مرکزی خیال ہی ہوتا تھا کہ وطن کو غلامی سے آزادی ملے۔ آزادی بڑی نعمت ہے۔ محکومی سے موت بہتر ہے۔ وہ ایک شعر اس موقع پر یاد آ گئے۔ اس لیے عرض کیے دے رہا ہوں:

میرا وطن آزاد کرا دے
اُجڑا چمن آباد کرا دے

جب مجھ جیسے ''ناشاعر'' انسان کے جذبات اشعار کی صورت میں ظاہر ہونے لگے اور وہ جو مجسم شاعر تھے اور جن کو خدا کی طرف سے شاعری کا ملکہ عطا ہوا تھا۔ ان حالات سے کتنے زیادہ مضطرب اور بے چین ہو گئے ہوں گے؟ جن کے دلوں میں اپنے وطن کی ذرا سی محبت تھی۔ انہوں نے انگریزی کے ظلم وستم کے خلاف آواز اُٹھا کر انقلاب وحریت کے جذبات بیدار کیے۔

انگریز کے خلاف علی الاعلان باغیانہ خیالات کا اظہار کیا۔ جوش اس گروہ کے سرخیل تھے۔ انہوں نے کئی نظمیں لکھیں۔ جن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب

ضبط ہو جانے کے باوجود بچہ بچہ کی زبان پر تھی۔ جوش نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ وقت نے سچ مچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے خون سے ایک نئے مضمون کی کہانی لکھنا شروع کر دی تھی اور ان کے لیے موت کا فرمان نافذ کر دیا تھا۔

نقشِ فریادی کے مطالعہ سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ فیض نے حب الوطنی کے جذبات، باغیانہ اور انقلابی خیالات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اردو شاعری کے متداوّل و معروف علامات کو سیاست و وطنیت، حریت و انقلاب کے لیے استعمال کیا ہے۔ رقیب، قفس، صیاد، نور، ساقی، گلشن، میکدہ، ناصح محتسب اب سب میں جدت و قدرت کے ساتھ بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ فیض نے عام شعرا کے برعکس رقیب سے کچھ اس طرح کی شکایت کی ہے:

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ اُلفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھنا
سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

شاہراہوں پر غریبوں کا لہو بکتا ہے
یا کوئی تو ند کا بڑھتا ہوا سیلاب ہے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لیے کہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

فیض کا دل وطن کی یاد میں تڑپتا ہے۔قید ہونے سے پہلے بھی وہ وطن کی محبت میں بے قرار رہتے تھے۔فوجی ملازمت نے انہیں نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرایا اور کب تک غریب الدیار رکھا۔ملازمت کے بعد ایک صحافی بنے،لیکن مادرِ وطن کی کسک اور تڑپ ان کے دل کو سوز و ساز عطا کرتی رہی۔

''دستِ صبا''میں ان کی آزادیٔ اسیری کے زمانہ کا کلام ہے۔اس مجموعہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض آہستہ آہستہ،شعوری یا غیر شعوری طور پر یا کسی فطری اور غیبی قوت کے ہاتھوں مجبور ہو کر نغماتِ حریت اور وطنیت میں سوز دروں شامل کر کے درد،تپش،گرمی اور حرارت پیدا کر رہے ہیں۔

امید،عزم،ہمت،استقلال اور اسی قسم کے اعلیٰ جذبات کی یہاں فراوانی ہے۔ان کے یہاں وطن میں کرب ہے مگر توانائی کے ساتھ۔وہ وطن کی یاد میں خود ہی آنسو نہیں بہاتے بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز یا وطن میں ''غم''مجسم بن جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں
نثار میں تری گلیوں پر اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

فیض نے اردو شاعری کو نیا آہنگ، نیا عزم اور نیا حوصلہ دیا۔ اگرچہ ابھی وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچے ہیں۔ ان کے بلند عزائم اور سوز دروں کی بھرپور ترجمانی الفاظ نہیں کر سکتے ہیں لیکن ان کی جدوجہد مسلسل جاری ہے وہ خود کہتے ہیں:

''طالب فن کے مجاہدے کو کوئی نرواں نہیں۔ ان کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش، فیض اپنے فن کی بلندی، وسعت، پختگی، رعنائی اور افادیت کے لیے مستقل کاوش بھی کر رہے ہیں اور دائمی کوشش بھی ان کا یہ کہنا حق وصداقت پر مبنی ہے۔''

ہمارے دم سے ہے کوئی جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

اُمید ہے کہ اس گل دامی و کج کلہی کو باقی رکھنے کے لیے فیض اپنے اس عہد پر استقلال کے ساتھ عمل کرتے رہیں گے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے!
جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اگر وہ اس پر عمل کرتے رہے تو جس طرح علامہ اقبال مرحوم ''متاعِ کارواں'' حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فیض بھی ''متاعِ لوح وقلم'' حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ فیض کے نظریہ کی پیروی کی جائے تاکہ معاشرہ امن وسلامتی کا گہوارہ بن جائے اور ہر فرد سر اُٹھا کے چلے۔

بینش شہزادی

ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کا المیہ

ناصر کاظمی کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہجرت ۱۹۴۷ء کی ہجرت نے ناصر کے ذہن کو بے حد متاثر کیا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہجرت کا ایک ایک واقعہ ان کے ذہن کے اندر سمایا ہوا ہے۔ اِن کی اس حالت کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔

اوّل تو یہ کہ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم اِس قدر بڑا المناک حادثہ تھا کہ کوئی بھی اس کا اثر لیے بغیر نہ رہ سکا اور شاعر ہونے کے ناطے ناصر کی شاعری پر اس حادثے کے دوررس اثرات نظر آتے ہیں۔ ہجرت کا اظہار ایک حد تک ناصر کی ذات اور شاعری کی پہچان ہے۔

دوئم یہ کہ سقوطِ ڈھاکہ (۱۹۷۱ء) میں تقسیم بنگال نے ناصر کی شاعری پر بہت الم ناک اثرات چھوڑے

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

ناصر کو اپنے علاقہ انبالہ سے بھی خاص الفت اور محبت تھی۔ انبالہ کی ہر چیز وہاں کی ہوائیں، موسم، چاند، سورج، پودے ہر وہ چیز ہے جو اس سے ملحک تھی۔ اس کی یاد کی کسک عمر کے آخری ایام تک بھی اِس سے دور نہ ہو سکی۔ انبالہ کو یاد کرتے ہوئے ناصر اپنے دل کا حال یوں بیان کرتا ہے:

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اُسی لیے ہوئے قریے کی روشنی

ناصر کو ہجرت کے تجربے نے بری طرح متاثر کیا ہے اور ماضی کی یادوں نے حال میں ناصر کو شاعری پر مجبور کر دیا۔ اجنبی مسافر ایک دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دوسری دنیا کے خواب تا عمر دیکھتا رہا۔ ناصر دکھی دل کا شاعر بھی ہے اس تمام عمر ماضی سے محبت کی ہے۔ اس کے نزدیک ماضی کے نشان ایسے ہی انسان کی یادداشت کا حصہ بن جاتے ہیں جیسے سوکھے ہوئے گلاب کے نشان کاغذ پر۔ ہجرت کے وقت انسان خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے اپنی پیاری یادوں کو بھی نہیں اُٹھا سکتا اور پھر تا دمِ آخر اس کو یاد کرتا ہے۔ سلیم احمد ہجرت کی واردات سے متعلق رقم طراز ہیں:

''ناصر کی شاعری اور ہجرت کی واردات ہمارے تصور پر ایک ساتھ وارد ہوتی ہے بلکہ ناصر نے ہمیں ہجرت کے المیہ کو محسوس کرنا سکھایا۔ ہجرت کے معنی ایک سرزمین کو چھوڑنا نہیں ہوتا یہ صوبوں کے انسانی رشتوں کو چھوڑنے اور ایک بالکل نئی صورت حال میں از سر نو زندگی شروع کرنے کا مسئلہ تھا۔''

سو ناصر کے یہاں ہجرت ان کے دور کے ہم عصر شعرا ادیبوں کی نسبت کیفیت و ملال کے ساتھ ساتھ مستقبل کے کئی روشن امکانات بھی لیے ہوئے ہے۔ ایسے انسان کی

مثالِ ققنس کی طرح ہے جو اپنی خاکستر سے دوبارہ جنم لے کر زندگی گزارتا ہے۔

نہ سمجھو تم اسے شورِ بہاراں

خزاں پتوں میں چھپ کر رو رہی ہے

ناصر نے اپنا تمام سفر ہجرت کے نتیجے میں شروع کیا تھا اور ساری زندگی خود کو اسی میں محدود ہے:

دھیان کے آتش دان میں ناصر

بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے

ناصر نے ہجرت کے بعد جب مشرقی پاکستان کا سفر کیا تو ماضی کی اداسی، یاد اور احساس کو اپنے ساتھ لے لیا کم از کم یہ نہ سہی اس کی مخفی یادیں ہی سہی:

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں

آئے ہیں اِس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

آفتاب احمد کے نزدیک یہ ہجرت کیا ہے؟ جس کو ناصر یوں بیان کرتے ہیں:

''ہجرت کے تجربے نے ناصر کو اِس حد تک اِسی لیے متاثر کیا تھا۔ اگلے وقتوں اور پرانی صحبتوں کی یادیں ناصر کی شاعری کا اندوختہ بن کر رہ گئی تھیں۔ یہ اجنبی مسافر تمام عمر مقام و وقت کی ایک دنیا میں کھڑا مقام و وقت کی ایک دوسری ہی دنیا کے خواب دیکھتا رہا۔''

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں

چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

ناصر کی شاعری میں ہمیں ہجرت کا عکس اِتنا صاف اور واضح دکھائی دیتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم اس سانحہ سے خود گزر رہے ہیں۔ اس ہجرت کے واقعہ نے نہ صرف اُسے اپنے عزیزوں سے دور کیا بلکہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کو طرب لگائی جب

وہ ہجرت کا ذکر کرتے ہیں۔ گویا ایک پورا دبستان ظلم و جبر کا ان کے سامنے آجاتا ہے۔

روداِد صفر نہ چھیڑ ناصؔر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

ناصر نے ہجرت کو محض ذاتی تجربے کی حیثیت سے نہیں بلکہ پوری مخلوق کے تجربے کی حیثیت سے محسوس اور بیان کیا ہے جو مشرقی پنجاب کے اضلاع سے خاک وخون کے ایک وحشت ناک سیلاب سے گزر کر آئی تھی۔ وہ خود بھی اس مخلوق کا فرد تھا۔ ناصر نے برگِ نے کے دیباچہ میں کہا تھا:

''آج کا شاعر ایک نئی آواز پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس کے اپنے گروہ پیش اور اس کی ایسی زمین و آسماں سے بھی علاقہ رکھتی ہو۔۔۔۔

۔۔۔اور پھر یہ تھی کہ ''دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن سکتی ہے یا نہیں۔''

ناصر سلطان کاظمی کے نزدیک ناصر کے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء کے اشعار میں ہجرت کے اجتماعی تجربے بے نشان، بے منزل قافلوں کے سفر اور عام تباہی اور برائی کی جتنی اثر انگیز تصویریں نظر آتی ہیں اِن کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔

نہ جانے کہاں لے گئے قافلے
مسافر بڑی دور جا کر ملے
آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

اِس طرح ناصر کی عام شاعری ''ہجرت'' سے متعلق ہے کیونکہ ہجرت نے ہی ان کو ایک نئی منزل کی طرف رواں دواں کیا اور یہ وہی تخلیقی قوت ہے جو ناصر کے آشوبِ ذات کا ایک اجتماعی تجربہ بنانے میں اس کی مدد کرتی ہے اور اِس سے ناصر کی انفرادیت اور الگ

پہچان ہوتی ہے۔

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تیری گلی میں تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

ناصر کی شاعری میں رات کا ذکر بہت زیادہ ہے اور یہ رات کی علامت اِس کے اندر موجود اُداسی اور ایک گہری خامشی کی غمازی بھی کرتی ہے۔ڈاکٹر نیّر صمدانی لکھتے ہیں کہ ناصر خود اپنے بارے میں کہتا ہے کہ:

''اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے اس کی وجہ اندھیری رات نہیں ہے۔یا وہ جسے ہمارے جدید شعرا ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے دنیا کی ہر چیز رات کو تخلیق ہوتی ہے۔''

کپڑے بدل کر بال بنا کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہو تو بہتر ہے

۱۹۴۷ء کے بعد کی شاعری میں ماضی کی بازگشت نمایاں ہو جاتی ہے اور ناصر کی یاد کے گلاب پوری طرح کھل اُٹھتے ہیں۔

''ناصر ان رونقوں کو یاد کرتا ہے اور اِن لوگوں کو یاد کرتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے دل کی تار ملاتا تھا۔''

ناصر نے ہجرت کے دوران جو تباہی و بربادی دیکھی جو ظلم وستم اپنوں پر ہوئے دکھایا اس پر اس نے غزلوں میں نوحے رقم کیے۔۱۹۴۷ء کے بعد کی غزلوں میں اس کی پہلی غزل اس کا نوحہ ہی تو ہے:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو

جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

سہیل احمد بتاتے ہیں ناصر نے ان نوحوں کے متعلق ایک دفعہ ٹی ہاؤس میں احمد مشتاق کا یہ شعر پڑھا تھا:

خالی شاخیں بلا رہی ہیں

پھولو آؤ کہاں کھلتے ہو

یہاں پر ناصر نے واضح کر دیا کہ یہ نوحہ ایسی ماؤں کا ہے جن کے پھول غدر میں اپنوں سے جدا ہو گئے ہیں مگر اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس کا کوئی مفہوم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے کئی ایک مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ناصر کاظمی کے بارے میں سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں کہ:

''ناصر کاظمی کی شعری سلطنت مختلف منطقوں میں نئی ہوتی ہے۔ اس کی سلطنت کا نقشہ سجے ہوئے شہروں، ٹھٹھری ہوئی راتوں، سونے راستوں، دھکے کنکروں، کانٹوں اور بے چراغ گلیوں، جلی ہوئی کھیتیوں، بدیسی جھیلوں، بجھے دنوں کے ڈھیروں، خاموشیوں کے قفل، دھوپ کے سائبان، زخم و گفا آتش خاموشی سے قریب ہوتا ہے۔''

ناصر کاظمی نے بہت سے موضوعات پر شاعری کی۔ ان کی شاعری میں وہ لہجہ اور وہ اندازِ بیاں موجود ہے جسے ہندوستان اور پاکستان کے لوگ دل سے محسوس کر سکتے ہیں۔ حمیر ہاشمی لکھتے ہیں:

''ناصر کاظمی کا نظر سے زیادہ زمین کے ساتھ گہرا رشتہ تھا اس زمین کے توسط سے اس کی پرندوں، درختوں، پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں، دریاؤں، نالوں اور ہر شے سے قربت تھی جس کے بدن سے اِس کو اپنی مٹی کی خوشبو آتی تھی ان کی تمام شاعری خوشبو کی بازیافت کا نام ہے۔''

ناصر کی زندگی میں ہجرت کی وجہ سے بے شک بہت بڑا یادوں کا سیلاب آنا ہے لیکن اِس کے باوجود یہ جمود پرست شاعر نہیں ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد زندگی کی تیز طرار موجوں کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔

''ناصر نے اپنے باطن سے ظاہر کی طرف اور ظاہر سے باطن کی طرف لاہور شہر میں ایک بستی بسائی۔''

ناصر نے اپنے دل میں آرزوؤں اور حسرتوں کے قافلوں کو قیام کے لیے جگہ بخشی اور لاہور کو ''شہرِ طرب'' کی خلعت بخشی۔

ایک شام وہ پاک ٹی ہاؤس میں ایک غزل لکھ کر لایا جس نے تمام لاہوریوں کا دل جیت لیا۔ وہ غزل کیا تھی؟ وہ تو آزادی کی تگ ودو اور اضطراب سے نڈھال قوم کے لیے ایک نفسیاتی لوری تھی۔

دن ڈھلا رات پھر آگئی سو رہو
منزلوں پہ چھا گئی خامشی سو رہو سو رہو
سارا دن تپتے ہوئے سورج کی گرمی میں جلتے رہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھر چلی سو رہو سو رہو

یہ مسلسل غزل ایک عجیب اور اجنبی روپ میں نظر آتی ہے۔ یہ دن کی دوڑ دھوپ سے رات تک سکون اور راحت کی طرف ہجرت کا اشارہ تھی۔ وہ رات اور وہ بات جو ہمارے جسم اور وجود میں مستور ہوتی ہے ناصر نے اس میں ہمارے نفس اور وجود میں چھپی رات کو اُجاگر کیا ہے۔

۱۹۵۲ء۔۱۹۵۳ء کا دور ناصر کاظمی کی شاعری میں نئی مہکاروں کا زمانہ ہے۔ اِس دور میں یاد، اداسی، تنہائی کی وہ شدت نہیں جو اس سے پہلے تھی۔ البتہ اِس دور میں ''چاند اور دھیان'' کے استعارے اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔

دل تو میرا اُداس ہے ناؔصر

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

چاند اور دھیان دو ایسے لفظ ہیں جو بہت کثرت سے آتے ہیں ہر مرتبہ معنی بدل بدل کر استعمال کیے جاتے ہیں۔ چاند کو دیکھ کر تو ناصر پر دیوانگی چھا جاتی ہے۔

شام سے سورج رہا ہوں ناؔصر

چاند کس شہر میں اُترا ہو گا

شہر اُجڑے تو کیا ہے کشادہ زمینِ خدا

اِک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

اس غزل میں ناصر نے پرانی قدروں کو پھر سے تہذیب کا حصہ بنانے کی ٹھان لی ہے اور عوام الناس کو پچھلے ظلم وستم کو بھلا کر صبر کا درس دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ اگلی منزلوں کے راستے ہموار کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

ناصر نے خود بھی اپنی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ اگر ہم عطر کی شیشی کھولیں تو خوشبو تو آئے گی، مگر پھول یا باغ نظر نہیں آئیں گے، اسی طرح ناصر کی شاعری عطر کی شیشی کی سی ہے۔ ان کی تمثالوں اور اشاروں سے ہمیں اپنے عہد کی خوشبو آتی ہے۔ ناصر کی شاعری موجودہ نہیں بلکہ آنے والے دور کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناؔصر

غم نہ کر زندگی بڑی ہے ابھی

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناؔصر

تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے

سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصؔر
یاد آئی ہے گل کی باس بہت

روتے روتے کون ہنسا تھا
بارش میں سورج نکلا تھا

ناصر نے سبز مرگ پر انتظار حسین کو جو غزل سنائی وہ ناصر کاظمی کی زندگی کا المیہ ہے۔

وہ ساحلوں پر گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

یہ غزل ناصر نے ۳۰/اپریل ۱۹۷۱ء میں اے وی ایچ میں بیماری کے دوران میں کہی تھی۔اس پر آفتاب احمد کہتے ہیں:

''یوں محسوس ہوتا ہے کہ اِس غزل میں ناصر نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ساری عمر کہنے کی کوشش کرتا رہا۔اس میں زندگی سے مایوسی بھی ہے اور زندگی کی حسرت بھی اور تمنا بھی۔رات کی تاریکی اور صبح کا انتظار بھی جو اپنے ساتھ نئے قافلے لانے والی تھی۔''

اس سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ناصر کا نوحہ ہے کیونکہ ناصر کی زندگی میں ہجرت کے الم ناک مناظر کبھی کبھی اوجھل نہیں رہے۔لمحہ بہ لمحہ اس کی کسک ناصر نے خود اپنے وجود میں سرکتی،اچھلتی،مچلتی دیکھی ہے۔ڈاکٹر سہیل احمد خان کہتے ہیں:

''ناصر کا سفر شہروں کے اُجڑے قافلوں کے لٹے اور اُڑتی ہوئی خاک کے

درمیان شروع ہوا تھا اور ساحلوں پر گانے والوں اور کشتیاں چلانے والوں
کے گم ہونے پر ختم ہوا۔‘‘

ناصر کاظمی کے کلام میں جہاں اس کے ذاتی دکھوں کی کہانیاں ماضی کی زندگی کی یادیں پرانی اور نئی بستیوں کا حال بھی رونقیں، ایک بستی کے بچھڑنے کا غم اور دوسری بستی بسانے کی حسرت تعمیر ملتی ہے وہاں وہ اپنے عہد اور اس میں زندگی بسر کرنے کے تقاضوں سے بھی غافل نہیں۔ اپنے کلام میں ان کا عہد بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی

یہ عمر ناصر کی پختگی کی عمر تھی اور شاعری میں اس کا رنگ نظر بھی آتا تھا۔ ناصر نے برگِ نے میں صحیح ہی تو کہا ہے:

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفل سخن میں
ہر دور کو غزل میں میرا نشان ملے گا

یہ دعویٰ ایک ایسا ہی شاعر کر سکتا ہے جس نے غزل کو نئی زندگی سے ہمکنار کیا۔ اس دور میں غزل کا پرچم بلند کیا۔ جب ہر جگہ نظم کا پرچم لہرا رہا تھا۔

’’غزل کا یہ ہرا بھرا درخت ماضی کی سرزمین میں جڑیں پیوست کیے ہوئے ہے
اور حال اور مستقبل میں اپنی شاخوں کے بازوؤں کو لہرائے ہوئے آنے والے
وقت کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔‘‘

اُردو زبان اور لفظوں کا صحیح استعمال

زبانِ غیر سے جب نام تیرا جانِ جاں نکلا
لگی اِک آگ تلوؤں سے کہ بس سر سے دھواں نکلا

یہ عجیب بات ہے کہ زندگی کی بعض نعمتیں جو ہمارے لیے نہایت ضروری ہیں ان کی قدر سے ہم بالعموم غافل رہتے ہیں۔ پانی کو دیکھیے یا ہوا کا خیال کیجیے ہم میں سے کم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پانی خدا کی عطا کی ہوئی بڑی نعمت ہے اور ہوا اس سے بھی بڑی نعمت، جس کے بغیر زندگی کا پل بھروسہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے انسان کی آنکھیں اور کان ہیں۔ ان کے بغیر زندگی کا اور اُس قسم کی زندگی کا جیسی ہم آپ بسر کرتے ہیں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ جب تک ہم میں سے کوئی بدقسمتی سے اندھا نہیں ہو جاتا یا ہماری سننے کی طاقت زائل نہیں ہو جاتی۔ ہمیں خیال نہیں ہوتا کہ یہ سننا اور یہ دیکھنا بہت بڑی نعمت ہے۔ جس کے لیے انسان کو ہر وقت خدا کا شکر گزار رہنا چاہیے۔

اب آپ غور فرمائیے کہ بعض نعمتیں (جیسی وہ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا)

خداداد ہیں۔بعض اورنعمتیں ہیں جوانسان اپنے لیےخود پیدا کی ہیں۔اگرذراغور کریں تو یہ بھی خدا ہی کا دین سمجھنے کا ذریعہ ہے۔اس دوسری قسم کی نعمتوں میں میرے نزدیک کوئی نعمت لفظوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ بندے کو اختیار وہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکے اور ہم سب ایک دوسرے سے بات کریں یہ ایک بہت بڑا عطیہ ہے۔اگر یہ عطیہ خدا کا نہ ہوتا تو انسان کا جینا دوبھر ہو جاتا۔

ایسی زندگی کا تصور کیجیے جس میں انسانوں کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کو الفاظ نہ ہوں اور ہمارے منہ سلے ہوئے ہوں یا زبانیں بند ہوں۔اس صورت میں بنی آدم کو کس قدم کی تاریخ نصیب ہوئی اور کس قسم کا تہذیب وتمدن دنیا میں رونما ہوتا۔

یہ جو کچھ ہزار ہا سال سے تختہ زمین پر نظر آرہا ہے یہ کرشمہ ہے۔اس بات کا کہ ایک انسان اپنے دل کی بات دوسرے انسان سے کہہ سکا۔جو کچھ انسان نے سیکھا وہ اپنے بیٹے کو اور پوتے کو بتا گیا اور اس طرح زندگی کا تجربہ ہزار برس بعد آنے والے انسانوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔

الغرض اگر الفاظ نہ ہونے تو نہ شعر ہوتا نہ فلسفہ، نہ سائنس ہوتی، نہ نت نئ ایجادات نہ انسان صحیح معنوں میں خدا کو پہچانتا، نہ خود اپنی انسانی نسل کے بھائیوں اور بہنوں کو، ہماری زندگی مکروہ اور گھناؤنی، حیوانیوں کی سی اور چندروزہ ہوتی! ہمیشہ یادرکھیے کہ اچھی زندگی ہمیں لفظوں کے طفیل نصیب ہوتی۔

جو قومیں تہذیب کی منزل میں داخل ہو چکی ہیں ان میں زندگی کے ضابطے کی پابندی کے ساتھ زبان کے ضابطے کی پابندی بھی ضرور پائی جاتی ہے۔ممکن ہے کہ آپ خیال کریں کہ ہم نے کبھی پانی اور ہوا کی طرح لفظوں کی ناقدری نہیں کی۔مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظوں کے متعلق جتنی ناقدری کا ثبوت ہم پاکستان کے لوگ دیتے ہیں دنیا کی کوئی اور قوم شاید ہی دیتی ہو جن الفاظ سے ہمیں دن رات سروکار رہتا ہے۔ہم ان سے صحیح طور پر واقف

ہوتے ہیں۔ نہ ان کے برتنے میں مناسب قسم کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں۔ بس جو غلط ملط زبان پر آ گیا کسی نہ کسی سے مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر بات پوری نہیں ہوتی تو سمجھتے ہیں کہ ہاتھ کی حرکت سے، آنکھ کے اشارے سے، بدن کے کسی عجیب وغریب فیشن سے مطلب دوسرے کی سمجھ میں آ جائے گا۔ محاورے کے علاوہ زبان کے روزمرہ کا لحاظ بھی ضرور ہے، ورنہ یوں معلوم ہوگا جیسے ہم کوئی بے معنی بات یا اچنبھے کی بات کر رہے ہیں۔

مثال: اردو میں ہم ''بہت بہت شکریہ'' کہتے ہیں محض ''بہت شکریہ'' (جو غالباً انگریزی کا لفظی ترجمہ ہے۔) انگریزی پڑھے لکھے لوگوں میں سے بعض کی زبان میں نے ایک عجیب مضحکہ خیز غلطی سنی ہے۔ کہتے ہیں ''میں صبح صرف ایک انڈا لیتا ہوں'' اور مراد ہوتی ہے ''کھاتا ہوں۔''

اس طرح ہمارے اخبارات اکثر لکھ جاتے ہیں ''فلاں صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی۔'' یہ انگریزی کا لفظی ترجمہ ہے۔ اردو میں تجویز رکھی نہیں جاتی پیش کی جاتی ہے۔ اس طرح کی ایک اور ترتیب ہے ''بہت زیادہ'' جو اُردو کے اخبارات ایک عجیب طریقے پر بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ''میرے والد ماجد آپ سے مل کر بہت زیادہ خوش ہوں گے۔'' یا ''پاکستانی سیاست دانوں کو چنیوٹ کی زرخیز زمین اور دھن دولت اکٹھے کرنے کا بہت زیادہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔'' یا ''اتنا اس لو ہے اور ہونے سے جتنا نہیں ہونا چاہیے۔'' ایسے موقعوں پر ''بہت ہی خوش ہوں گے۔'' اور ''حد درجے کا اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔'' لکھنا صحیح ہے۔

میرے محترم و پیارے استاد ڈاکٹر شبیر کا کہنا ہے کہ:

''میڈیا والے اور اخبار نویس غلط الفاظ اس طرح بولتے ہیں جس طرح ڈھیروں نیکیوں کا ثواب ہو۔''

ایک اور عام غلطی ہے جو آپ نے اکثر لوگوں کی زبانی بنی ہوگی۔ مثلاً کہتے ہیں

''کافی'' تشویش ہوئی یا ''کافی'' عذاب ہوا۔ لیکن ''کافی'' وہ چیز ہوتی ہے جو ''حسب ضرورت'' ہو۔ اب تشویش یا عذاب کی کسی کو ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ اس مصیبت کے ''کافی'' ہونے کی تمنا کرے! کہنا چاہتے ہیں ''بہت'' تشویش یا ''سخت'' عذاب اور کہتے ہیں ''کافی'' اس طرح بے احتیاطی لوگ کبھی کبھی ''امید ہے'' کے استعمال میں کر جاتے ہیں۔ مثال لکھتے ہیں: ''امید ہے کہ تہلیل و شہباز آئندہ چنیوٹ جائیں گے۔'' حالانکہ کہنا صرف یہ چاہتے تھے ''خیال ہے کہ تہلیل و شہباز۔۔۔ یا غالباً تہلیل و شہباز و عاصم۔۔۔'' امید صرف کسی اچھی چیز کی باندھی جاتی ہے۔ جس اخبار نے دونوں کے متعلق جملہ لکھا اسے صاحب موصوف کے چنیوٹ جانے کی کوئی آرزو نہ تھی۔

لفظوں کے غلط استعمال کے شائقین کبھی کبھی صرف غلط املا کا سہارا لے کر دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ ''دونوں'' لکھنے کی بجائے ''دونو'' لکھتے ہیں لیکن اس لفظ میں سے نون غنہ غائب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''تینوں'' اور ''چاروں'' کو ''تینو'' اور ''چارو'' لکھنا۔ یہ اخبار نویس حضرات ''پروا'' کو ''پرواہ'' اور ''بے پروائی'' کو ''بے پروائی'' لکھ کر دو زبانوں یعنی اردو اور فارسی ستم توڑنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ اردو میں فارسی سے آیا ہے۔

غلط نگار حضرات کی ایک اور عام عادت ''اٹھارھویں'' کو ''اٹھارویں'' لکھ ڈالنا ہے۔ لکھنے کی عام غلطیاں اس قدر زیادہ ہیں کہ سب کا شمار اس مختصر مضمون میں نہیں کرایا جا سکتا۔ بہرحال بعض چھوٹی چھوٹی باتیں اس قابل ہیں کہ یاد رکھی جائیں۔ ''معما'' ''ا'' سے لکھا جاتا ہے۔ ''ہ'' سے ''معمہ'' لکھنا غلط ہے۔ جہاں ''مرتبے پر فائز ہونا'' لکھا ہو وہاں ''فائز'' ''ز'' سے لکھنا چاہیے ض سے فائض غلط ہے۔ اس طرح ''حیرانگی'' اور ''درستگی'' لکھنا غلط ہے۔ صحیح لفظ ''حیرانی'' اور ''درستی'' ہیں۔ کچھ اس سے بھی زیادہ ناجائز بلکہ مہمل ان لوگوں کی روش ہے جو غصے کے جوش کے لیے غیض کا لفظ لکھتے ہیں غیض و غضب۔ یہاں صحیح لفظ ''غیظ'' ہے۔ اس کے ساتھ اگر لفظ ''غضب'' کا اضافہ ضروری ہو تو ''غیظ و غضب'' لکھنا

چاہیے نہ کہ ''غیض وغضب۔''

ایک اور عجیب سی غلطی ہے جو ہم میں سے بعض لوگ پنجابی گفتگو میں تو بھول کر بھی نہیں کرتے لیکن اگر وہی بات اردو میں کہیں تو اردو کے تکلف میں آ کر ضرور غلط کہتے ہیں مثلاً یہ جملہ سنیے:

''مشاعرہ کی شام کو بارش ہونے لگی۔'' کہنا یوں چاہیے تھا ''مشاعرے کی شام کو بارش ہونے لگی۔'' اس طرح ''کلکتہ سے شملہ تک'' غلط ''کلکتے سے شملے تک'' درست۔

میرے عزیزو، آج کی گفتگو کے لیے میں نے کیوں یہ موضوع تجویز کیا؟ اس لیے کہ آپ کی عمر میں لفظوں کی پرکھ کا شوق دل میں پیدا کر لینا ایک بڑا انعام ثابت ہوتا ہے اور اگر اس سے غفلت کی جائے تو ذہن کے کئی خانے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بعض لوگوں کو رنگ پھول پتوں کے ہرے اور پیلے اور لال رنگ نظر نہیں آتے۔ جدید نفسیات نے ان کے لیے ''رنگ نابیں'' ''رنگ کور'' کی اصطلاح تجویز کی ہے۔

آپ میں سے ہر ایک میں یقیناً یہ صلاحیت ہے کہ لفظوں کو پرکھنے کی عادت ابھی سے ڈال لے اور پھر ذوق و شوق اور غور وفکر کی ایک نئی دنیا کو اپنے اندر موجود پائے۔ اس دنیا میں داخل ہونے کے لیے ذہن کی وہ آنکھ کھلی رکھیے جو لفظوں کو دیکھتی ہے اگر آپ کی یہ حس بیدار رہی تو آپ کو ہمیشہ خبر رہے گی کہ لفظ کس طرح صحت سے ادا ہوتے ہیں اور کس طرح انھیں صحیح جملوں میں ڈھالا جاتا ہے۔

ہمیں اپنی زبان کو وہ معیار دینا ہوگا جو عرب میں عربی اور ایران میں فارسی کو حاصل ہے۔ تاکہ ہم زبانوں کی عالمگیر برادری میں شامل رہ سکیں۔ حافظ لیاقت کا کہنا ہے:

> ''اب اس نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا فرض ہے کہ اردو نثر کو اس طرح قابل بنائیں کہ وہ موجودہ حالات پر اسی طرح پوری اترے جس طرح انگریزی، جرمن اور روسی نثر پوری اتر رہی ہے۔''

یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ زبان ایک جمہوری ادارہ ہے۔ اس جمہوری ادارے کے اصول وقوانین قوم کے خواص وعام کی باہمی رضامندی سے طے ہوتے ہیں اور جب ایک بار طے ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی رضامندی کے بغیر بدلتے نہیں۔ جب میں نے زبان کو ''جمہوری ادارہ'' کیا تو مراد یہ ہے کہ لفظوں اور محاوروں کے معنی قوم کے کروڑوں افراد نے مقرر کیے ہیں اور معیاری قوم اور اس کے بزرگوں نے صدیوں میں ان کو وہ صورت دی جو آج نظر آتی ہے۔ آنے والی نسلیں اس موجودہ صورت میں تبدیلیاں پیدا کریں گی جس طرح ۳ یا ۴ سال پہلے ہوئیں اور جس طرح گزشتہ صدی کی زبان میں خود ہم نے تبدیلیاں کیں۔

یہ بات ضرور یاد رکھیں کہ زبان کا روزمرہ نہ حکومت کے فیصلے سے بدل سکتے ہیں نہ عوام الناس کے فساد سے جو کوئی اس آئین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ آپ اپنا نقصان کرتا ہے۔

حافظ لیاقت کا کہنا ہے کہ میرے خیال کے مطابق:

''لفظوں کا صحیح استعمال قومی زبان سے محبت کا ثبوت ہے۔ قومی زبان کا احترام اپنے آباؤ اجداد کا احترام ہے جنھوں نے ہمارے غور وفکر اور قوم کے ذہنی تجربات وحسیات کے اظہار کے لیے یہ عظیم الشان ذریعہ وضع کیا۔''

ہم لوگوں کے لیے خاص طور پر ضروری ہے کہ اپنی تہذیبی زندگی میں قومی زبان کی تاریخی اہمیت کو پہچان لیں کیونکہ ہماری قومی زبان ہماری سرکاری زبان نہیں ہے۔ یہ کبھی نہ بھولیے کہ لفظوں کا صحیح استعمال انسان کی ترقی کا ضامن ہے اور قومی زبان سے بے نیاز ہو کر قومیں زندہ نہیں رہتیں۔

قوموں کا امتیاز ہے تنہا زبان سے
ورنہ کسی کا نام بھی باقی نہیں رہا

محمد ناصر

اردو کی کہانی اردو کی زبانی

میرا نام اردو زبان ہے۔ میں پاکستان کی قومی زبان ہوں۔ میری پیدائش کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ کسی کو بھی میری درست پیدائش کا علم نہیں۔ اس کی ایک وجہ مجھ سے محبت کرنے والوں کی کمی بھی ہوسکتی ہے۔ اکثریت کی رائے کے مطابق میری ابتدا برصغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد سے ہوئی۔ مجھ کو لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے۔

۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں مجھ کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا۔ آج بھی پاکستان کی قومی زبان ہوں۔ میں پاکستان اور اس میں رہنے والے باشندوں سے سوال کرتی ہوں کیا مجھے قومی زبان ہونے کے باوجود مجھ کو میرے حقوق مل رہے ہیں؟ میرے بھی بہت سے حقوق ہیں جن کا اکثریت کو پتا ہی نہیں ہے۔ مجھ سے بدنصیب اور کون ہوگا؟ کہ میرے ہی ملک میں میرے حقوق پورے نہ ہوں۔ مجھ کو آج کمتر زبان سمجھا جا رہا ہے مجھے اس بات کا کوئی دکھ نہیں کہ دوسرے ملکوں کے لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت بھی مجھ سے نفرت اور مجھ کو ناپسند کرتی ہے۔

میں اکثر اس بات سے پریشان رہتی ہوں کہ میرے چاہنے والوں کی دن بہ دن کمی ہو رہی ہے اور ان کے اندر سے آہستہ آہستہ شعور بھی کم ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں آج کل میری دشمن زبان انگریزی ہے۔ میرے سارے کے سارے حقوق انگریزی کو دیے جا رہے ہیں۔ میرے صبر کی انتہا تو دیکھو پھر بھی میں خاموش ہوں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اس میں انگریزی کا کیا قصور ہے؟ قصور تو میرے ملک کے باشندوں کا ہے۔

میں سوال کرتی ہوں کیا انگریزی مجھ سے بہتر ہے؟ کیا اس کا رسم الخط مجھ سے زیادہ اچھا ہے؟ کیا اس کے اندر الفاظ کا ذخیرہ مجھ سے زیادہ ہے؟ کیا یہ مجھ سے زیادہ شعور سکھاتی ہے؟ کیا یہ لکھنے اور پڑھنے میں زیادہ آسان ہے؟ کیا اس کے حروفِ تہجی کی تعداد مجھ سے زیادہ ہے؟ کیا اس کے اصول و قواعد مجھ سے زیادہ ہیں؟ کیا انگریزی کے اندر مجھ سے تعلیم و تربیت زیادہ ہے؟ جواب میں خود دیتی ہوں بالکل بھی نہیں۔ ہاں ایک بات میں تسلیم کرتی ہوں کہ انگریزی دنیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے، مگر میں بھی کسی سے کم نہیں میرا بھی تیسرا نمبر ہے۔

پاکستانی عوام اپنے قیمتی اثاثہ قومی زبان کو خود اپنے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ دفن کر رہے ہیں۔ انگریزی کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھا جا رہا ہے۔ اگر آج انگریزی کے بارے میں کوئی بات کرے تو میرے ملک کے لوگوں کو بہت ہی بری لگتی ہے۔ میرے ملک کے لوگ انگریزی کو ہی اپنی عزت و وقار، پہچان اور کامیابی سمجھتے ہیں۔

انگریزی میں بات کرنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں اب تو گالیاں بھی انگریزی میں ہی دینا پسند کرتے ہیں۔ میری طرح آپ کو بھی حیرانی ہو گی پیار بھی اب انگریزی میں کرنا پسند کرتے ہیں۔ انگریزی کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کم ہے تو اب اس نے میرے الفاظ چورانا شروع کر دیے ہیں۔ جیسے سکول، کالج، لائٹ، یونیورسٹی، اسٹیشن، فریج، موبائل یہ سب الفاظ میرے ہیں۔ انگریزی کے اندر بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور اب

صرف انگریزی کے ہی سمجھے جانے لگے ہیں۔ حالانکہ ان الفاظ کا مادہ میرے اندر موجود ہے۔

میں آپ کو ایک کام کی بات بتاتی ہوں۔ آج پاکستان کے اندر شرح خواندگی کم ہونے کی ایک خاص وجہ انگریزی نظامِ تعلیم ہے۔ یہ بات آپ کو آپ کے مفکر اور دانشور جانے کے باوجود بھی نہیں بتائیں گے۔ انگریزی ایک مشکل زبان ہے جس کو سمجھنا اور لکھنا کافی مشکل ہے۔ اسی وجہ سے اکثر طالب علم فیل ہو جاتے ہیں۔ آخر کار تنگ آ کر تعلیم کو خدا حافظ کہہ دیتے ہیں۔

کبھی کبھی مجھ کو ہنسی آتی ہے اور بہت زیادہ دکھ ہوتا ہے کہ پاکستان کی اکثریت میرے ہزاروں الفاظ کو غلط پڑھتی ہے۔ اس میں پروفیسر، اساتذہ، طالب علم، پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب شامل ہیں۔ ہنسی اس بات پر آتی ہے جب اپنی قومی زبان اردو کے ساتھ یہ حال ہے تو بچاری انگریزی کا کیا بنتا ہوگا۔

مجھے قومی زبان کا درجہ تو حاصل ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بھی مجھ کو خوش کرنے کے لیے دیا گیا ہو۔ آج کل انگریزی زبان کو دفتری زبان کے طور پر پاکستان میں زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ حق میرا ہے۔ پرائمری سے لے کر مڈل تک، مڈل سے میٹرک تک، میٹرک سے ثانوی تعلیم تک، ثانوی سے اعلیٰ تعلیم تک سارا کا سارا نظام تعلیم انگریزی میں کیا جا رہا ہے، البتہ کر دیا گیا ہے۔

چند ایک ڈگریاں ہیں جو صرف مجھ میں یعنی قومی زبان میں کروائی جاتی ہیں۔ مجھ کو میرے ہی ملک سے آہستہ آہستہ کم اور آخر کار ختم کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ اب تو بات برداشت سے باہر ہے کہ میرے طالب علموں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کے بارے میں طرح طرح کے سوال کیے جاتے ہیں۔ ایک اور کام کی بات آپ کو بتاؤ آج تعلیم کو صرف ذریعہ معاش سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میرے ملک کی اکثریت انگریزی

تعلیم کو حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہے اور پھر خود ہی افسوس میں کہتے ہیں کہ ہمارا ملک ترقی نہیں کر رہا ہے، لوگوں میں شعور نہیں ہے۔ شعور انگریزی میں کہاں سے آیا۔ میں دونوں کام کرتی ہوں شعور بھی سکھاتی ہوں اور ذریعہ معاش بھی بنتی ہوں اور ترقی کی طرف لے کر جاتی ہوں۔ انگریزی میں یہ سب خوبیاں کہاں؟ پھر بھی آپ غلط فہمی کا شکار ہو۔

مجھ کو تو میرے حقوق حاصل نہیں ہیں مگر میرے طالب علموں (یعنی مجھ سے محبت کرنے والے اور مجھ کو شوق سے پڑھنے والے) ان کو بھی میرے کرنے کی وجہ سے ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ کیا ان طالب علموں کا صرف یہ قصور ہے کہ یہ اپنی قومی زبان اردو بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں۔

میں آپ سے سوال کرتی ہوں جس طرح انگریزی اور دوسرے مضامین میں نوکری کے اشتہارات آتے ہیں۔ اسی طرح اردو میں کیوں نہیں؟ اردو پڑھنے والوں سے بار بار یہ سوال کیوں کیا جاتا ہے؟ کہ آپ نے اپنا مستقبل تباہ کر لیا ہے۔ کیا آپ کو اور کوئی شعبہ نظر نہیں آتا۔ اردو کی وجہ سے آپ کو نوکری نہیں ملے گی۔ اردو کی وجہ سے آپ نے دھکے کھانے ہیں۔ کیوں مزاق سے دوسروں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ اردو کا شاعر ہے۔

اے عقل کے اندھوں کیا رزق میں انگریزی اور دوسرے مضامین کے ہاتھ میں ہے۔ کیا آپ لوگ ذریعہ معاش کے ساتھ ساتھ عقل و شعور بھی حاصل نہیں کرنا چاہتے؟ اور یہ سب صرف اور صرف آپ کی اپنی زبان اردو آپ کو سب کچھ سکھاتی ہوں۔ ایک دفعہ میری گہرائی میں اتر کر تو دیکھو پھر آپ کو میری اہمیت کا علم ہوگا۔ پھر آپ کا ملک و قوم ترقی کرے گی۔ پھر آپ کے اندر شعور، عقل و دانائی پیدا ہوگی۔

آج میں آپ کو بتاتی ہوں کیونکہ میں آپ سب کی ہمدرد ہوں۔ انگریزی کو اگر آپ اپنی ترقی کا راز سمجھتے ہو تو آپ غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں آج آپ سے پوچھتی ہوں کیا چین کی حیران کن ترقی انگریزی کی وجہ سے ہے؟ کیا فرانس، ترکی، اٹلی کی ترقی انگریزی

ہے۔ عالمی جنگ کے نتیجے میں بری طرح تباہ ہونے والا ملک جاپان تباہ ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ ترقی کی حیران کن منازل طے کرنے میں کیا انگریزی کا ہاتھ ہے۔ کبھی بھی نہیں ہوسکتا ہر ملک، قوم، معاشرہ اور مذہب صرف اور صرف اپنی بنیادی تعلیم کی وجہ سے ہی ترقی کرتا ہے۔

کسی بھی قوم کی ترقی اس کی بہتر تعلیمی شرح میں ہے اور بہتر تعلیمی شرح کا حصول اس کی اپنی مادری اور قومی زبان ہی میں ممکن ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو آپ پر یہ راز کھلے گا کہ بہتر تعلیمی شرح اور اپنی مادری اور قومی زبان میں تعلیم کے حصول نے نہ صرف اس قوم و ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ وہاں امن اور بہتر معاشرتی اور معاشی ترقی میں بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔

میں آپ کو ایک اور مثال دیتی ہوں۔ امریکہ کی ایک عام ملک سے سپر پاور ملک بننے میں کس کا ہاتھ ہے۔ اس کی مادری اور قومی زبان انگریزی کا، میں انگریزی کے خلاف نہیں ہوں مگر جن کی مادری زبان ہے صرف ان کے لیے ہی موزوں ہے میرے ملک کے باشندوں کے لیے نہیں۔

فرانسیسی مشترق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ:

> ''قوموں میں کوئی چیز اس قدر اختلاف پیدا نہیں کرتی جتنا یہ کہ اُن کی زبانیں مختلف ہوں اور کوئی چیز اتنا اتحاد و یگانگت پیدا نہیں کرتی جتنی کہ ایک مشترک زبان۔''

اس کی مثال بھی میں آپ کو یاد کرواتی ہوں۔ ہم سب کو یاد ہوگا کہ جب ہم نے اپنے ملک کی دو قومی زبانیں بنالیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سال میں دو خود مختار ملک وجود میں آ گئے۔ پاکستان اور دوسرا مشرقی پاکستان۔ دو زبان ہونے کی وجہ سے پاکستان کا دل کا ٹکڑا اس سے ہی جدا ہو گیا۔ اگر ایک زبان ہوتی تو ہمارے اندر قومیت، یک جہتی اور

محبت پیدا ہوتی۔

میرے ملک پاکستان کو بنے تقریباً 67 سال ہو چکے ہیں۔شاید میرے ملک کے باشندے میری ہی اہمیت کو بھول گئے ہوں تو آج میں آپ کو اپنی اہمیت یاد کرواتی ہوں۔ میں مذہب اسلام،قرآن وحدیث کو سمجھنے کا ذریعہ ہوں۔اپنے ملک کے اندر اور باہر بات چیت کا ذریعہ ہوں۔پیغام رسانی کا کام کرتی ہوں۔اظہار کا ذریعہ ہوں۔خیالات کا ذریعہ ہوں۔میں انسانوں کے روزمرہ امتیازی کاموں کا سہارا ہوں۔میں تجربات زندگی کی محافظ ہوں۔ میں ذہن کو چمکاتی ہوں، ذہن کی تربیت اور تنظیم کرتی ہوں اور اس میں جمالیاتی احساس پیدا کرتی ہوں اور میں ذریعہ معاش کا بھی ایک بہت بڑا ذریعہ ہوں۔ میں اپنے ملک کے لوگ کے اندر قومیت، یک جہتی، بھائی چارہ،خلوص ومحبت پیدا کرتی ہوں۔

مجھے ملک پاکستان کے موجودہ سیاست دانوں سے ایک شکوہ بھی ہے کہ پاکستان کو بنے تقریبا 67 سال ہو چکے ہیں مگر میری بہتری کے لیے کوئی کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ میرے بجائے دوسری زبانوں کو فروغ دیا گیا ہے۔

مجھے فخر ہے اپنے شعروں اور عظیم سیاست دانوں پر جنہوں نے پاکستان بنانے میں اور میری ترقی اور بقا کے لیے نواب وقار الملک،فیض احمد فیض،میر تقی میر اور دیگر قابل ذکر ہے۔میرے لیے قائداعظم نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء جلسہ عام ڈھاکہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں آپ کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی صرف اردو اور اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہوسکتی اور نہ کام کرسکتی ہے۔دوسرے ملکوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے بس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے وہ صرف

اردو ہی ہوگی۔"

علامہ اقبال نے قومی زبان کے حوالے سے فرمایا:

"اردو مسلمانوں کی قومی زبان ہے۔"

سرسید سے تو میں بہت ہی زیادہ خوش ہوں کیونکہ آپ نے میری بقا اور ترقی کے لیے کافی زیادہ خدمات سرانجام دیں۔

جب ہندوؤں نے اردو کو ختم کرنے کی جدوجہد ۱۸۶۷ء سے ہی شروع کر رکھی تھی لیکن سرسید احمد خاں نے اپنا اثر و رسوخ اور دلائل کی قوت کرے انہیں اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں بنارس میں مقام پر قومی زبان کے حوالے سے فرمایا:

"اگر ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب کا یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب برصغیر ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے درمیان بٹ جائے۔"

اے میرے ملک کے باشندوں میرا صرف سب کے لیے ایک ہی پیغام ہے اگر اپنی اور اپنے ملک کی بھلائی چاہتے ہو تو صرف اور صرف اپنی قومی زبان کو فروغ دو۔

عزیز احمد کے ناول گریز کے فکری وفنی پہلو

عزیز احمد اُردو ناول نگاروں میں اپنا ایک مخصوص ومنفرد مقام رکھتے ہیں۔اُنہوں نے اپنے متعدد ناولوں کے ذریعے اُردو ناول نگاری کی روایت میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ان کے ناولوں میں ہوس، شبنم، ایسی بلندی ایسی پستی، گریز، آگ وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے ناولوں میں ایک لطیف رومانی احساس کارفرما ہے۔ان کے ناول گریز میں یہ رومان جنسی ہے جو جان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ان کے ابتدائی ناولوں میں یہ چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن جیسے جیسے لمحات بدلتے ہیں رومان اور جنس کے اشتراک سے سماجی لمحات گزرتے ہیں۔رومان اور جنس کے اشتراک سے سماجی شعور اختیار کرتے چلے جاتے ہیں وہ اپنے ناول گریز میں بھی کسی نہ کسی طرح سماجی مسئلے کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔گریز ناول فنی اور فکری لحاظ سے ایک خوبصورت ناول تصور کیا جاتا ہے۔

فکری پہلو

ناول گریز کو اگر موضوعاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں ایک نرالی فکر جھلکتی

ہے۔جیسے:

☆ غربت وافلاس کے باوجود تعلیم حاصل کرنا اور آئی سی ایس تک پہنچنا۔

اس ناول کا بنیادی کردار جو کہ نعیم ہے وہ غربت میں بغیر ماں باپ کے تعلیم حاصل کرتا ہے اور پھر آئی سی ایس کے امتحانات میں کامیابی پاتا ہے۔

☆ انگریزی کا ایک بھوت کی طرح سر پے سوار ہو جانا۔

کہ اس دور میں لوگ کا اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم کے لیے پاگل ہونا جیسے اس کی مثال یہ ہے:

''حیدرآباد کے ترقی پسند نواب اپنی چار سے آٹھ نو برس کی عمر کی لڑکیوں اور اسی عمر کے لڑکوں کو داخل کر دیا کرتے۔۔۔ان بچوں کے والدین کا یہ خیال تھا کہ سب سے اچھا بورڈنگ ہاؤس وہی ہے جس کی فیس زیادہ ہوگی۔''(۱)

☆ اپنی ثقافت کو نظرانداز کرنا اور غیر ملکی ثقافت کو ترجیح دینا اس کی مثال درج ذیل ہے:

''خانم اور عاقل خاں کے بعض عزیزوں نے اُنہیں سمجھانا چاہا کہ انگریزیت کی نقل اور چیز ہے اور انگریزوں کے ہنر سیکھنا دوسری بات ہے۔''(۲)

☆ ہندوستان اور انگلستان کے لوگوں کے رہن سہن میں واضح فرق۔

☆ کارل مارکس کا نظریہ۔

☆ پردیس میں ہم وطنوں سے خاص اُنسیت۔

☆ جنسی تشنگی کا عنصر۔

☆ غربت اور پھر خودداری کا عنصر۔

☆ عشق کی تقسیم۔

☆ تہذیبوں کا انجذاب۔

☆ مرد کا صنفِ نازک کے متعلق الگ سی نفسیاتی کیفیت۔

☆ موت کا تصور اور انسانی زندگی کا کس قدر غیر یقینی ہونا۔

اس کے بارے میں نعیم کے دوستوں کے مکالمے درج ذیل ہیں۔ جیسے:

> ''ابھی تک آدمی محض اس ایک چیز کو فتح نہیں کر سکا ''موت کو''۔ یہ اس کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ موت اُس کے تمام آلام کا راز ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو قومیں جنگ نہ کرتیں۔''(۳)

☆ ہندوستان اور یورپ کے سیاسی و اقتصادی حالات و واقعات۔

☆ جدت پسندی کا عنصر۔

ناول گریز کے فنی پہلو

فنی نقطہ نظر سے گریز کو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کی فنی خوبیاں اپنی الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے فنی پہلو درج ذیل ہیں:

ا۔ پلاٹ	۲۔ اسلوب	۳۔ کردار نگاری
۴۔ مکالمہ نگاری	۵۔ جزئیات نگاری	۶۔ منظر نگاری
۷۔ مناظر فطرت	۸۔ اشعار کا استعمال	۹۔ تلمیحات
۱۰۔ استعارات	۱۱۔ تشبیہات	۱۲۔ حقیقت نگاری
۱۳۔ عریانی کا پہلو	۱۴۔ انگریزی الفاظ کی بہتات	۱۵۔ محاکات
۱۶۔ سراپہ نگاری	۱۷۔ حقیقت پسندی	۱۸۔ ظرافت کا پہلو
۱۹۔ رومانوی رنگ		

پلاٹ

ناول گریز کا پلاٹ مربوط اور خوبصورت ہے۔ اس کو مصنف نے دس ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب میں قصے کو ایک الگ اور شاندار طریقہ سے بیان کیا ہے۔ اس ناول

میں ہر کردار اور ہر واقعے کو بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں مصنف نے کہانی کو ہیرو نعیم کی ڈائری سے بھی ملانے کی کوشش کی ہے اور اس کو ایک کہانی کے طور پر نرالے انداز میں پیش کیا ہے۔اس کا پلاٹ مربوط اور خوبصورت ہے۔

کردار نگاری

کردار نگاری کسی بھی ناول یا دوسری کہانی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں کردار کی بدولت ہی کہانی آگے بڑھ سکتی ہے۔اس کہانی میں نعیم کا کردار بنیادی کردار ہے جو ایک نوجوان ہے اور یورپ میں عیش وعشرت میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ نعیم ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔اس کے بارے میں سمیعہ بانو نے اپنے مقالہ میں کچھ یوں بیان کیا ہے کہ:

''نعیم کا کردار اس عہد کے ایک ایسے پڑھے لکھے نوجوان کا کردار ہے جو سماجی اور تہذیبی اعتبار سے دوراہے پر کھڑا ہے۔مغربی تہذیب کی چمک دمک لیکن ساتھ ہی اس کا کھوکھلا پن کا ظاہرتاً مشرق کی روایت پرستی ہے لیکن اس کے کردار کی مضبوطی بھی عیاں ہے۔''(۴)

جزئیات نگاری

جزئیات نگاری میں کسی بھی کل کو الفاظ میں اُس کے جزو بیان کرنے کو جزیات نگاری کہتے ہیں۔اس ناول گریز میں جزیات نگاری جگہ جگہ ملتی ہے۔جیسے:

''اسی در کے سامنے دالان میں ایک میز اور ٹوٹی کرسیاں تھیں۔میز پر کتابوں کا انبار رہتا اور آخری در کے مقابل پلنگ بچھا ہوا تھا۔جس پر ایک موٹا سا گدا تھا اور اس کا بچھونا جو ایک سوزنی، دو تکیوں اور ایک کمبل پر مشتمل تھا۔''(۵)

مناظرِ فطرت

اس میں خوبصورت مناظر کو جوں کے توں پیش کیا جاتا ہے جیسے:

''ہلکے ہلکے سفید بادلوں سے آفتاب کی روشنی چھن رہی تھی۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ طاق پر ناشتہ رکھا تھا۔ چڑیاں آج بھی پراٹھے کا ذرا سا ٹکڑا نوچ کر کھا گئی تھیں۔''(۶)

منظر نگاری

منظر نگاری کسی بھی کہانی میں ایک خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ اس میں الفاظ کے ذریعے سے ایک خوبصورت سین بنا دیا جاتا ہے جس کو ہم منظر نگاری کہتے ہیں۔ جیسے:

''موجیں شاعری کر رہی تھیں ریشم کے پہاڑ بلند ہو رہے تھے اور پھٹ رہے تھے اور گر رہے تھے۔ ریشم کی چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔''(۷)

اشعار کا استعمال

اس ناول میں شاعر لوگوں کے اشعار کا استعمال بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ جیسے:

''دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا''(۸)

محاکات نگاری

محاکات سے مراد کسی خاص قسم کے واقعات کو لفظوں سے تصویر کے ساتھ بیان کرتا۔ جیسے:

''جہاز نے دائیں جانب حرکت کی تو اُس نے میرے بائیں کان میں جھک کے محبت کا اقرار کیا۔ پھر وہ مسکرائی پھر میرا مذاق اُڑایا، پھر ہنسی اُڑائی، پھر فرشتوں کی طرح میری پریشانی سے پریشان ہوئی مجھے تسلی دی اور نیند کے ساتھ مل جل کر غائب ہوگئی۔''(۹)

تلمیحات کا استعمال

اس ناول میں تلمیحات کا استعمال بھی ملتا ہے۔جیسے:

''جہاز کوہِ طور کے قریب سے گزر رہا تھا میں نے فاروقی صاحب سے کہا، حضرت موسیٰؑ کو دیدار نصیب ہوا بھی تو ان رتیلے،خشک پہاڑوں میں۔اُنہوں نے جواب دیا''بصیرت چاہیے۔''(۱۰)

عریانیت

اس ناول میں مغربی تہذیب کی آئینہ داری ہے۔اس لیے عریانیت کے عناصر بہت ملتے ہیں۔جیسے:

''ایک نشست پر ایک مزدور ایک نوجوان لڑکی کا بوسہ لینے کی کوششیں کر رہا تھا۔وہ تجربے کر رہی تھی اور آس پاس کی نشستوں پر لوگ ہنس رہے تھے۔''(۱۱)

تشبیہات

تشبیہات میں ایک چیز کو کسی دوسری چیز کی طرح قرار دیا جاتا ہے۔اس میں بھی تشبیہات کا عنصر ملتا ہے۔جیسے:

''سرخ اور سفید رنگ اس کی باہوں میں بھرا ہوا تھا جیسے شیشے میں شراب جس کا نشہ دیکھنے والے کو بھی مخمور کرے۔''(۱۲)

استعارات

استعارات میں ایک چیز کو ہو بہو دوسری چیز کی طرح قرار دیا جاتا ہے۔جیسے:

''بلقیس زندہ مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔''(۱۳)

سراپہ نگاری

سراپہ نگاری میں کسی بھی انسان کا سراپہ بیان کیا جاتا ہے۔جیسے:

''بلقیس کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے۔ چہرہ گول اور رنگ اس قدر صاف جیسے اینگلو انڈین لڑکیوں کا اُس کی عمر تیرہ برس کی تھی مگر اچھی خاصی بھرے بھرے جسم والی تھی۔''(۱۴)

ظرافت کا پہلو

اس ناول کی ایک اور خوبصورتی اس کی ظرافت ہے جو کہ قاری کو مسکرانے پر مجبور کرتی ہے۔ جیسے:

''تقریباً پر مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔۔۔شہزور خاں بھی تقریباً ب ب بہہ بہت بولتے ہیں۔ اُن سے ک ک ک کسی نے پوچھا پر آپ کا۔۔۔ ل لل لڑکا ہے اُن کے لڑکے کے متعلق۔۔۔تو شہزور خان نے جواب دیا۔۔۔جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔تقریباً۔''(۱۵)

ناول گریز کا تنقیدی جائزہ

عزیز احمد کے ناولوں میں سب سے زیادہ شہرت گریز کو حاصل ہوئی ہے جس میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ جو آئی۔سی۔ایس کے لیے منتخب ہوتا ہے وہ اس کے ذریعے انگلستان اور دوسرے ممالک کی سیر کرتا ہے۔ ناول میں ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کے زمانے کو دکھایا گیا ہے۔اس ناول میں دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔

اس عہد کے نوجوانوں کی طرح نعیم کی ذہنیت بھی یورپ جا کر تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر زندگی کی عیش پرستی اور لذت کوشی کو سمونے کی کیسی کیسی کوششیں کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے دیس بدیس گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کا ماحول اس پر پوری طرح غالب نظر آتا ہے۔ایک دل پھینک نوجوان ہونے کے ناطے عورت محض اِس کے لیے کشش جنس کی حیثیت رکھتی ہے۔اس لیے وہ خوبصورت عورتوں کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔لیکن ان میں سے وہ کسی کو بھی اپنا نہیں پاتا۔

شاید اس لیے کہ اُسے ایک مکمل اور خاص عورت کی تلاش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں کئی عورتوں کے کردار آتے ہیں۔ جن میں مغرب ممالک کی عورتیں زیادہ ہیں جس کی وجہ سے رومان اور جنس کی شدت نعیم کے فکر پر حاوی نظر آتی ہے۔

اس ناول کے معاشی اور سیاسی پس منظر میں بھی جنسی حقائق غالب نظر آتے ہیں۔ نعیم زندگی کی تلخ حقیقتوں اور یہاں تک کہ وہ محبت اور عشق کی تلخیوں سے بھی گریز کرتا ہے۔ ۲۰ ویں صدی کے بدلتے ہوئے اہم رجحانات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اس کے اندر کسی طرح کی بندش نہیں ہے۔ نہ اخلاقی اور نہ ہی مذہبی قدروں کی پاسداری۔ اس کی حالت ایک ایسے نوجوان کی سی ہے جو کشمکش اور تذبذب کا شکار ہے۔

اسے خود نہیں معلوم کہ اُسے کس چیز کی تلاش ہے۔ وہ سائنسی ایجادات اور نئے علوم وفنون سے واقف ہے۔ لیکن زندگی سے مطمئن نہیں ہے۔ یورپ کی چمک دمک سے بھی متاثر ہے۔ اس میں ہندوستان کے لوگوں کی حالت کا بھی ذکر ہے کہ وہ کیسے دوسری تہذیب کو اپناتے ہیں۔ اس کے بارے میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ:

> ''اس ناول نے پہلی دفعہ ہماری زبان میں یورپ کو اس کے سیاسی واقتصادی اور جنسی انداز کو ہندوستانی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔''(۱۶)

اس ناول میں لوگوں کی ذہنی کیفیت کا بیان ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو نظر انداز کرتے ہوئے انگریزی تہذیب کو اپناتے ہیں اور درمیان میں ایک پل بن کر رہ گئے ہیں ان کو یہ بس فیشن کے طور پر عزیز ہے۔

اس کے علاوہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ نوجوان نسل دین سے دور ہو کر بے راہ روی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ اُن کے قریب گناہ اور ثواب کا کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ بغیر کسی جھجک کے گناہ کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ اس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ غریب کی اس معاشرے میں کوئی

value نہیں ہے کہ نعیم جب غریب تھا تو اُس کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا مگر جب اُس نے آئی۔سی۔ایس کیا تو بلقیس کی ماں اُس کو اپنا داماد بنانے پر تل گئی۔

گریز ناول میں مغربی عیاشی کا ذکر ہے کیونکہ مغربی روایات میں اس کا کوئی گناہ نہیں مگر ہمارے مذہب میں اس سے منع بھی فرمایا ہے اور حقارت کی نظر سے بھی دیکھا گیا ہے مگر پھر بھی مسلمان غلط کام کرنے سے نہیں رکتے۔

یہ دنیا ایک امتحان ہے اور اس امتحان میں کامیابی اُن کے لیے کس قدر ناگزیر ہے کہ وہ ہر ہر لمحہ بدکاری کے قریب جاتے ہیں۔ دوسری طرف اس میں محبت کو ایک غلط روپ دے دیا گیا ہے۔ محبت ایک پاک رشتے کا نام ہے مگر اُس دور میں اس کو صرف ایک جنسی سکون سمجھا جاتا تھا اب بھی کچھ ایسا ہی سمجھا جا رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عزیز احمد، گریز، لاہور، مکتبہ جدید، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۴۷

4. Parwazmagzine.blogspot.com/2011/02/blog-post-3142.html

۵۔ عزیز احمد، گریز، لاہور، مکتبہ جدید، ۲۰۰۰ء، ص ۵

۶۔ ایضاً، ص ۶۶

۷۔ ایضاً، ص ۳۴

۸۔ ایضاً، ص ۵۹

۹۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۱۔ عزیز احمد، گریز، لاہور، مکتبہ جدید، ۲۰۰۰ء، ص ۹۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۶۔ ڈاکٹر محمد سمیع الرحمٰن، عزیز احمد کے ناول گریز کا تنقیدی مطالعہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص ۴۲

مطالعہ کتب

کہا جاتا ہے کہ کتاب تنہائی کا بہترین ساتھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کتاب ہماری بہترین ناصح اور مشفق رہنما اور بہترین معلم ہے جو ہمیں نہ صرف نت نئے علوم سے متعارف کراتی ہے بلکہ دنیا بھر کی معلومات سے بھی ہمیں روشناس کراتی ہے۔ زندگی کے نشیب وفراز سمجھاتی ہے۔ مستقبل کے خطرات اور مشکلات سے آگاہ کرتی ہے اور زندگی کی تاریک راہوں میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہے جب ہم زندگی کی تلخیوں سے دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں تو کتاب ہی ہمیں سکون واطمینان مہیا کرتی ہے۔ کتاب کے ذریعے ہم بڑے بڑے فلسفیوں، ناقدین اور شعرا کا نظریہ ان کی فکر سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مطالعہ کتب کے بھی کچھ اصول ہیں جن سے ہمیں آگاہ ہونا چاہیے جو کتاب آپ پڑھ رہے ہو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔ بغیر مقصد کے کتاب پڑھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے امتحان سے ایک دن پہلے کوئی ناول شروع کریں اور اس ناول کا آپ کے امتحان کے ساتھ کوئی تعلق

بھی نہ ہوتو یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔اس لیے موقع کی مناسبت سے کتاب کا انتخاب اور کسی مقصد کے تحت کتاب کا مطالعہ انسان کے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

اچھی کتاب کے مطالعے سے نہ صرف زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور اس کو حل کرنے میں مددفراہم کرتی ہے بلکہ مزید ترقی اور مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت بھی پیدا کرتی ہے۔

اس لیے میں اپنے جیسے نوجوان طلبا و طالبات سے یہ گزارش کروں گا کہ جہاں آپ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے پیسے لگاتے ہیں وہی اپنی جیب خرچ سے کتب کی خریداری کے لیے بھی کچھ پیسے خرچ کیا کریں۔

جن پیسوں سے ہم کتاب خریدتے ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہمیں فائدہ ہی پہنچائے گی۔میں ان طلبا و طالبات کو خراجِ تحسین بھی پیش کرتا ہوں جو اپنی جیب خرچ کا بیشتر حصہ خریداری کتب میں صرف کرتے ہیں یقیناً ان کا یہ عمل قابلِ تحسین ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو آج کے نوجوان طلبا و طالبات مشرف قبولیت بخشیں گے اور میری گزارش پر غور وفکر ضرور کریں گے اور کتاب کو اپنی تنہائی کا ساتھی بنائیں گے۔

جذبہ

شہر کی مصروفیت بھری گلیوں سے لے کر دل کی وحشت زدہ وادیوں تک، پہاڑوں کی بلندیوں، دل کی گہرائیوں تک، انسان کے ظاہری روپ سے اس کے باطنی روپ تک، مسکراتے چہروں سے آنسوؤں میں ڈوبتی آنکھوں تک ایک ایسا رشتہ/ناطہ/جذبہ انسان کے ساتھ ہر وقت موجود رہتا ہے جو انسان کی تنہائی کا ساتھی ہوتا ہے۔ اس کا ساتھ اس وقت دیتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے۔

وہ رشتہ/وہ جذبہ پیار، الفت، محبت کا رشتہ ہے۔ یہی جذبہ جب برصغیر کے الگ الگ پارٹیوں میں تقسیم مسلمانوں کے اندر بیدار ہوتا ہے تو وہ یکجا ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کی صورت اختیار کر کے اقبال کے خواب کی تکمیل میں محمد علی جناح کی قیادت تلے پاکستان کے نام سے اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ وہی جذبہ ہے جو ایم۔ایم عالم کو 65 کی جنگ کا ہیرو بناتا ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جو سیالکوٹ کے مقام پر فوجیوں کا بھارتی ٹینکوں کے نیچے گھس جانے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ایٹمی بم بنانے کے

بعد بھی جیل کی سلاخوں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بھی اس کے دل میں تر و تازہ رہتا ہے۔اب ایک لمحہ رک کر سوچیے ! کیا ہمارے اندر بھی وہی جذبہ ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا بیدار ہے؟ کیا ہم صرف ''پاکستان کھپے'' یا جیوے جیوے کے نعرے لگا کر اپنے جذبے کی تکمیل اظہار سمجھتے ہیں۔

جناب! اگر ہمارے اندر وہ جذبہ ہے تو اسے صرف نعروں تک نہ رہنے دیں۔ اسے بیدار کریں اور اپنے اسلاف کی طرح پاکستان کو پھر اسلام کا قلعہ بنانے کا خواب اِقبال پورا کریں۔ کیا ہمارا جذبہ پیار صرف اتنا ہے کہ ہم سڑکوں پر نکل کر اس ملک کی ہر چیز کو توڑتے چلے جائیں، اپنی پارٹی کے لیڈر کے بارے میں اگر کوئی نازیبا الفاظ کہہ ڈالیں تو ہم اس پارٹی کے ورکروں اور دفتروں کو آگ لگا دیں۔

یہ سب غیرت کے نام پر ہونے والے ڈرامے ہیں۔

الغرض۔۔۔اگر ہمارے اندر بھی وہ جذبہ پیار کا موجود ہے تو اس کو بیدار کر کے ہر اس میدان میں خلوص نیت کے ساتھ کام کریں جس میں آپ موجود ہیں۔ یا کم از کم اپنے آپ کو اس جذبہ/ پیار کے صحیح ڈھانچے میں ڈھالیے۔ جب وہ جذبہ اپنے عروج پر پہنچے گا تو یہ معاشرہ بھی ٹھیک ہو گا۔ نظام میں بھی اگر کمی ہے تو صرف اسی جذبہ کی۔۔۔خلوص کی کمی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ دیس بھی حقیقت میں اسلام کا قلعہ بنے گا۔

اقبال کے خوابوں کو تعبیر ملے گی۔۔۔

خطباتِ اقبال ــــ ایک تنقیدی جائزہ

اقبال نے افکار کی ترسیل کے لیے جہاں اعلیٰ پائے کی شاعری کی وہاں اپنے خطبات کے ذریعے بھی اپنی فکر اہلِ دانش تک پہنچائی۔ آپ کے یہ خطبات انگریزی میں

"The Reconstruction of Religious thought in Islam."

کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ سات خطبات کا مجموعہ ہے۔ پہلے چھ خطبات انہوں نے دسمبر ۱۹۲۸ء اور جنوری ۱۹۲۹ء کے درمیان مسلم ایسوسی ایشن کے مدارس کی دعوت پر مدراس، حیدر آباد دکن اور علی گڑھ میں پڑھے تھے۔ یہ خطبات سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے جب کہ ۱۹۳۴ء کے بار دوم میں ان میں ساتویں خطبے کا اضافہ کیا گیا۔ ان خطبات کا موضوع اِسلامی فلسفے کی جدید سائنس کی روشنی میں نئی تشکیل ہے اور ان خطبات کو علامہ کے فلسفے اور فکر میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

ان خطبات کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے ۱۹۳۶ء میں علامہ کی زیرِ نگرانی شروع کیا اور ان کی زندگی میں یہ ترجمہ مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن علامہ کی شدید علالت کی وجہ سے

یہ ترجمہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۷ء میں بزمِ اقبال، لاہور نے اسے شائع کیا۔

سید نذیر نیازی کے بقول ان خطبات کا اردو نام تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ بھی علامہ نے خود رکھا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر وحید عشرت نے ان خطبات کا اُردو ترجمہ تجدیدِ فکریاتِ اسلام کے نام سے کیا ہے جو کہ اقبال اکادمی، لاہور نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔

مندرجہ ذیل دو اُردو ترجموں کے علاوہ ان خطبات کے مندرجہ ذیل اُردو تراجم بھی ہو چکے ہیں:

۱۔ ''تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر'' از ڈاکٹر محمد سمیع الحق، نئی دہلی

۲۔ ''اسلامی فکر کی نئی تشکیل'' از شہزاد احمد، لاہور

۳۔ ''مذہبی افکار کی تعمیر نو'' از پروفیسر شریف کنجاہی

ان اُردو ترجموں کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں:

۱۔ پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی

۲۔ عربی ترجمہ تجدید التفکیر الدینی فی اسلام از عباس محمود

۳۔ فارسی ترجمہ احیائے فکر دینی اسلام از احمد آرام

۴۔ فرانسیسی ترجمہ از مادام ایوا میورووح

۵۔ جرمن ترجمہ از ایکسل مونئے وٹامس سمئیر

سات خطبوں کے علاوہ کتاب کے شروع میں علامہ کا ایک مختصر دیباچہ بھی شامل ہے۔ خطبات کے عناوین اس طرح سے ہیں۔ عناوین کا اردو ترجمہ ڈاکٹر وحید عشرت کے ترجمے سے لیے گئے ہیں۔ جب کہ علامہ کے اصل عناوین بھی دیے جا رہے ہیں:

۱۔ علم اور مذہبی مشاہدہ:

"Knowledge and Religious experience"

۲۔مذہبی واردات کے انکشافات کا فلسفیانہ معیار:

"The philosophical fest of the revelations of Religious experience."

۳۔خدا کا تصور اور دعا کا مفہوم:

"The conception of God and the meaning of Prayer."

۴۔انسانی خودی، اس کی آزادی اور لافانیت:

"The human ego. His freedom and immorality."

۵۔مسلم ثقافت کی روح:

"The spirit of Muslim culture."

۶۔اسلام میں حرکت کا اصول:

"The principle of revelent in the structure of Islam."

۷۔کیا مذہب کا امکان ہے:

"Is Religious possible."

جیسا کہ پہلی بار یہ خطبے ۱۹۳۰ء میں لاہور سے شائع ہوئے۔ دوبارہ یہ خطبات بعض لفظی ترامیم اور ایک مزید خطبے کے اضافے کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں انگلستان میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے "Reconstruction of Religious thought in Islam" سوسائٹی لندن "Aristotelian Society" کی دعوت پر ۱۹۳۲ء میں پڑھا۔

علامہ اقبال کے یہ خطبات اسلامی حکمت اور مغربی فلسفہ کا نچوڑ ہیں۔ ان خطبات میں حضرت علامہ نے موجودہ زمانے کے فکری مسائل اور فلسفیانہ موضوعات پر اسلامی

حکمت کے حوالے سے تنقید بھی کی ہے اور مغرب کے جدید علوم کی روشنی میں حکمتِ اسلامیہ کے بعض مسائل کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے یقین کی حد تک حضرت علامہ نے کوشش کی ہے۔ حضرت علامہ نے خطبات کے مقدمے میں فلسفے کی حدود اور طریقِ کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

فلسفیانہ افکار میں کوئی قطعیت موجود نہیں ہوتی۔۔۔

''میرے پیش کردہ نظریات سے ممکن ہے بہتر اور مناسب نظریات پیش کیے جائیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم فکرِ انسانی کی روز افزوں ترقی کا منظر غائرِ مطالعہ کرتے ہوئے آزادانہ تنقید کا طریقِ کار اختیار کریں۔''

حضرت علامہ نے اِن خطبات کی تیاری میں یہی طریقِ کار اختیار کرتے ہوئے اِنسانی فکر کا جو سرمایہ ان تک پہنچا اس کی تنقید اور تنقیح کر کے مختلف فلسفیانہ مسائل پر اپنی رائے کا اِظہار کیا اور ایک مرتب نظامِ فکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اسلامی اِلٰہیات کی جدید تفسیر پر مبنی ہے۔

علوم جدیدہ کی اصطلاحات کی روشنی میں مذہبی واردات کے حوالے سے اِسلامی الٰہیات کی یہ تشریح بذاتِ خود بہت مشکل کام تھا۔ ان خطبات کے اس قدر مشکل انگریزی زبان میں تحریر کرنے کا سبب جب حضرت علامہ سے دریافت کیا گیا تو ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی روایت کے مطابق حضرت علامہ نے فرمایا:

''مسلمانوں میں دین والا آدمی جب فلسفے کی اِصطلاحوں میں بات کرتا ہے تو اس کی بات میں وقار اور وزن پیدا ہو جاتا ہے، مگر محض فلسفے والا آدمی جب دین کی بات کرتا ہے تو اس کی نہ فلسفیانہ حیثیت ہوتی ہے اور نہ دینی لحاظ سے اُس میں وزن۔''

حضرت علامہ کے اِرشاد کے مطابق اِن خطبات کا ترجمہ ''تشکیل جدید الٰہیاتِ

اسلامیہ'' کے نام سے کیا گیا۔اس نام کی وضاحت کرتے ہوئے سیّد نذیر نیازی لکھتے ہیں:

''۔۔۔'تشکیل' ایک نئی فکر کی تشکیل ہے۔'الٰہیات' عقل اور ایمان کا وہ نقطہ اتصال ہے جس کی بنا علم پر ہے اور 'اِسلام' محسوس حقائق کی اس دنیا میں زندگی کا راستہ ہے۔''

خطباتِ اقبال میں اقبال نے وہ افکار جو شاعری میں قدرے چھپے ہوئے انداز سے ظاہر تھے انھیں واضح اسلوب میں بیان کیا اور بہت سے فکری اور فلسفیانہ سوالات کے ذریعے انھیں پوری وضاحت سے بیان کیا۔ یہ یقیناً ایک عظیم علمی سرمایہ ہے جو ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

قلم قرطاس کی طرف سے طلبا وطالبات میں تحت اللفظ نظم پڑھنے کا مقابلہ

فیصل آباد(سٹی رپورٹر)ادبی مجلس قلم قرطاس شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی کے تحت طلبا وطالبات کے لیے تحت اللفظ نظم پڑھنے کا مقابلہ منعقد کرایا گیا جس میں طلبا وطالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔مقابلے میں پہلی پوزیشن محمد حمزہ، دوسری مائرہ منظور جبکہ تیسری پوزیشن بینش شہزادی نے حاصل کی۔پوزیشن ہولڈر طلبہ میں انعامات مہمان خصوصی ڈاکٹر آصف اعوان نے تقسیم کی۔اس موقع پر ڈاکٹر طارق ہاشمی، حافظ حیات، ناصر وارثی ودیگر بھی موجود تھے۔

اُردو نظم ـــــ دو مطالعات

''اردو نظم اور معاصر انسان'' ایک تاثر

انسان کیا ہے؟ اس کا اس کائنات اور اس کے خالق سے کیا رشتہ ہے؟ کیا وہ محض ایک نامیاتی وجود یا مادّی مظہر ہے یا علوی اور روحانی کشش و گریز کا استعارہ؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوال فکر و فلسفہ کی قلمرو اور اقلیم شعر میں اٹھتے رہے ہیں اور اٹھتے رہیں گے۔ طارق ہاشمی نے اپنا واسطہ صرف اردو شاعری بلکہ نظم سے رکھا ہے۔ کلاسیکی اردو غزل کے تصور انسان سے بہ سرعت گریز کرتے ہوئے اور پھر اردو نظم کے عہد بہ عہد منظر نامے میں جھانکتے ہوئے وہ بیسویں صدی میں قدم زن ہوتے ہیں اور اقبال اور مابعدِ اقبال نظم گو شعرا کے تصورِ انسان سے بحث کرتے ہیں۔ وہ برعظیم کی ڈیڑھ صدی کی سماجی صورتِ حال کے تناظر میں اردو نظم کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ تخلیق کاروں اور پھر ناوابستہ شعرا کے تصوراتِ انسان سے تعرض کیا ہے۔ ان کی نگاہ اس آشوب کو تیز روشنی میں لانے کا اہتمام کرتی ہے جس کا مظہر سلیم احمد کا یہ مشہور مصرع ہے:

''ہمارا سفر اب مقید سے مطلق کی جانب نہیں ہے۔''

''گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے'' کا یہ ہوش ربا سفر اردو نظم نے کس طرح نو بہ نو پیرایوں میں طے کیا ہے اور ہمارے عہد کے اضطراب، وسوسے، شکستِ خواب کے نوحے اور بیگانگی اور روحانی و نفسی شکست و ریخت کے نقشے کس طرح ہماری جدید نظم میں ظاہر ہوئے ہیں، اس کا اجمالی مگر عمدہ تجزیہ آپ ان اوراق میں پائیں گے۔ ہاں اسلامی ادب کے بعض علمبرداروں مثلاً نعیم صدیقی اور کسی بھی تحریک سے ناوابستہ شعرا مثلاً جمیل مظہری جیسے اہم لکھنے والے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ان اوراق سے غیر حاضر ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی پیش نظر کتاب نظیرا کبرآبادی سے جدید ترین نظم گو شعرا کے تخلیقی حاصلات سے بحث کرتی اور ان کے تصورات انسان کو آئینہ کرتی ہے۔ طارق ہاشمی نے تجزیے اور تحلیل کا یہ سفر بڑے پر اعتماد اور پر تیقن لہجے میں طے کیا ہے۔ امید ہے اردو دنیا اس کتاب کا پر جوش خیر مقدم کرے گی۔

تحسین فراقی

مجلس ترقی ادب لاہور

جدید نظم کی تیسری جہت

جدید اُردو نظم ہماری ادبی تاریخ کا ایک ایسا اہم باب ہے جس پر سنجیدہ غور و فکر کی کمی رہی ہے۔ نظم کو اس کی فارم اور مافیہ کے حوالے سے بہت کم زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے اور اگر ایسے مطالعات لکھے بھی گئے ہیں تو ان کی نوعیت درسی رہی ہے اور جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان کی حیثیت سرسری رہی ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی ہے کہ نظم کا جو تصور نئے علوم کے ساتھ ہماری تخلیقی زندگی میں وارد ہوا تھا اس کے ساتھ ہماری روحانی سرگزشت وابستہ تھی۔ اقبال اس نئے آفاقی طرزِ احساس کی عظیم مثال ہیں۔

طارق ہاشمی نے اس آفاقی طرزِ احساس کو جدید نظم کے حوالے سے زیر بحث لا کر برصغیر کے تہذیبی شعور کے در و بام وا کیے ہیں جن کی جانب ہماری نگاہیں شاذ و نادر ہی دیکھتی رہی ہے۔ کرداروں کے رگ و پے میں جو جذبے اور تجزیے تڑپتے نظر آتے ہیں، ان کا مطالعہ اس لیے بھی لازمی تھا کہ ہم جان سکیں کہ ہماری روح پر جو کیفیت اترتی رہی ہے اس کا درست ادراک کیا ہے۔ اس اعتبار سے طارق ہاشمی نے جدید نظم کو ایک تاریخ ساز دریچہ فراہم کیا ہے۔

''جدید نظم کی تیسری جہت'' افکار و محسوسات کی کہانی میں ایک نئی سمت کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ شاعری کو روحانی سرگزشت کا سرچشمہ بنانے میں نظم نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اُردو نظم نے اپنے کرداروں کے ذریعے ہماری نمائندگی کی ہے اور کہاں تک اس مقصد میں کامیاب رہی ہے؟ اس کتاب کے قارئین کے لیے یہ سوال بھی کم دلچسپ نہ ہوگا۔ اُردو ادب میں طارق ہاشمی کا مطالعہ ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ ہمارے عہد کو ایسے طرزِ احساس اور طرزِ فکر کی بڑی ضرورت ہے۔

جیلانی کامران

افسانے

حافظ محمد حیات	مہہ وش نواز

دیارِ یار

سخت گرمی اور دھوپ کے باوجود بھی اپنے کام میں مگن، ہر چیز سے بے نیاز، ایک ایک جوڑے کو دیانت داری کے ساتھ دھوتا ہوا بخشو، صبح سے دھونے دھوبی گھاٹ آیا مگر اس کو معلوم نہیں تھا کہ خدا نے اس کو آج ہی اولاد جیسی نعمت سے مالا مال کرنے والا ہے

(بخشو کی شادی آٹھ سال پہلے کریمن بی بی سے ہوئی تھی، بڑی منتوں مرادوں کے بعد خدا نے ان کو خوشی دی تھی) اسے اس کا پڑوسی بھاگتے ہوئے اسے دور سے آوازیں دے رہا تھا۔۔۔بخشو۔۔۔بخشو۔۔۔۔تمہیں مبارک ہو۔۔۔مبارک ہو۔۔۔۔

بخشو نے جیسے ہی مبارک ہو کی آواز سنی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور ساتھ ہی خدا کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

بخشو نے پڑوسی کو سینے سے لگایا اور دونوں جلدی سے کپڑے اٹھانے میں لگ گئے تاکہ گھر جلدی پہنچ سکیں۔۔۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنے بیٹے کو پیار کیا، باقی تمام خوشی کی رسمیں ادا کی گئی اور کچھ

دنوں بعد اس کا نام ''عاشق حسین'' رکھا گیا۔ بخشو اور اس کی بیوی بڑے بڑے لوگوں گھروں میں دھوبی تھے، ان کے کپڑے لے کر آتے، دھو کر پھر ان کے گھروں میں واپس کر آتے۔ اسی طرح ابھی ایک سال کا عرصہ گزرا تھا کہ بخشو واپسی پر آتے ہوئے ایک حادثے کا شکار ہوتا ہے اور اپنی جان کھو بیٹھتا۔

ہے اب اس ننھی جان کو کیا پتہ تھا کہ اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔۔۔

کریمن بی بی! نے بخشو کی وفات کے بعد بڑے شیخ صاحب کے گھر نوکرانی لگ گئی، وہ ان کے گھر کے کام کاج کرتی اور ان کے کپڑے بھی دھو کر لاتی۔

اس نے شیخ صاحب سے اجازت لی کہ میں اپنے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لے آیا کروں کہ گھر میں کون اس کا خیال رکھے گا۔؟

شیخ صاحب نے اجازت دے دی۔ اب عاشق حسین، شیخ صاحب کی اکلوتی بیٹی ''ماہ نور'' کے ساتھ دن بھر کھیلتا رہتا اور اس کی ماں ان کے گھر کے کام کر لیتی۔

وقت گزرتا گیا، دونوں دس سال کی عمر تک پہنچ گئے۔ ایک دن بیگم صاحبہ نے کہا، کریمن! اب تمہارا بیٹا بڑا ہو گیا ہے تم اب اس کو اپنے ساتھ ہمارے گھر نہ لایا کرو۔ کریمن نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

(ماہ نور، اور اس کا بیٹا دونوں کھیل کود میں مصروف تھے، دونوں کی آپس میں اچھی دوستی بھی تھی کیونکہ ان کا بچپن اکٹھا گزرا تھا۔)

عاشق حسین!.جی اماں

کریمن! چل بیٹا گھر چلے اور کل سے تم میرے ساتھ نہیں آؤ گے۔

عاشق حسین! پر کیوں اماں۔؟

کریمن! کیونکہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ (اماں نے جواب دیا)

عاشق حسین! اماں ہم اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں ابھی تو ہم نے جی بھر

کے باتیں بھی نہیں کیں اور جی بھر کے کھیلا بھی نہیں۔

(ماہ نور، پاس کھڑی اپنے دوست کی باتیں سن کر اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی)

خیر! اب بیگم صاحبہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دو یکجا دلوں کو جدا ہونا پڑا، عاشق حسین کو دیارِ یار سے جلا وطن کر کے گھر کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ اب دونوں اطراف کے باسی اپنے محکوم ہونے پر نوحہ کناں تھے اور دل کی بستیوں پہ اداسی کے گھنے بادل منڈلا رہے تھے۔ عاشق حسین بالکل ایک قیدی کی طرح زندگی گزار رہا تھا اسے نہ دن کو چین آتا، نہ رات کو چین آتا۔ بس ہر وقت دیارِ یار کی آزاد فضاؤں میں رہنے کی تمنا اسے بغاوت پر اکساتی رہتی۔۔

وہ، چونکہ غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا تو پھر وہ کیا اور اس کی آزادی کی اہمیت کیا۔؟

اسے اپنی اداسی کے ساتھ، اسی قید میں اپنے آبائی پیشے سے منسلک ہونا پڑا اور اسی ''دیارِ یار'' کے باسیوں کے کپڑے دھونے پڑے اس کی ماں جب واپس اپنے گھر آتی تو وہ اس سے مخبر کی طرح ''دیارِ یار'' کی باتیں پوچھتا۔ اس کی ماں اس کی ان حرکتوں سے تنگ آ چکی تھی۔ وہ ماہ نور کے کپڑے انتہائی احترام کے ساتھ دھوتا، بار بار اسی کو دھوتا بلکہ دن کا زیادہ وقت اسی کے کپڑوں کے گزارتا اس کو بس اک یہی سہارا تھا قیدِ تنہائی کاٹنے کا۔۔۔

اس کی اماں اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر دل ہی دل میں بہت کڑھتی رہتی اور پریشان ہوتی کہ اس لڑکے کا کیا بنے گا۔ اسی طرح کوئی سات سال کا عرصہ گزر گیا، ایک دن حسبِ عادت اس نے اپنی ماں سے ماہ نور کا پوچھنے لگا کہ وہ کیسی ہے۔؟

اس کی ماں نے تنگ آ کر کہہ دیا کہ ''ماہ نور مر گئی ہے'' بس پھر کیا تھا کہ اس نے اپنے نام کی لاج رکھتے ہوئے ایک پل بھی اپنے محبوب کے بنا جینا گوارہ نہ کیا اور ایک مثالی عاشق کی طرح اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ تمام تر رسومات کے بعد کریمن جب

اس کال کوٹھری میں جاتی ہے تو اسے کاغذ کے چند ٹکڑے ملتے ہیں جن کاغذوں پر سات سال میں اس قیدی نے تخیلانہ زندگی بسر کی تھی، اس نے قیدی کی آخری نشانی سمجھ کر اسے سنبھال لیا اور کپڑے اٹھا کر شیخ صاحب کے گھر کی طرف چل دی۔ وہاں کے لوگوں کو ادھر جیل کے حالات معلوم نہیں تھے، ''دیارِیار'' کے باسی حکمرانوں کی طرح رعایا کی فکر سے بے نیاز ہو کر اپنی عیاشیوں میں محو تھے۔ کپڑوں کی گٹھری کھول دی گئی اور ماہ نور نے سب سے پہلے اپنا سوٹ اٹھایا اور جلدی سے کپڑے تبدیل کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی، وہ فوراً ہی واپس آئی اور کریمن کے منہ پہ ایک غریب کی قسمت کی طرح سوٹ دے مارا اور کہا'' آج تم نے کس طرح میرے کپڑے دھوئے ہیں۔؟

پہلے تو تم بہت اچھی دھلائی کرتی تھی پہلے کی طرح کیوں نہیں دھوئیں تم نے۔؟

کریمن نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ایک غریب اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ اگلے دن بھی یہی ماجرا تھا، وہی کپڑوں کی صفائی نہ کرنے کا گلہ، اب کی بار تو کریمن نے کہہ ہی دیا۔

''چھوٹی بی بی!! وہ تمہارا عاشق مر گیا ہے جو تمہارے کپڑوں کو خلوص اور محبت کے ساتھ دھوتا تھا جس کی محبت کی خوشبو کی مہک تمہیں محسوس ہوتی تھی، میں وہ خلوص، محبت، وہ خوشبو کی مہک کہاں سے لاؤں۔؟

کریمن کی یہ بات سنتے ہی اس نے بیگمات کے روایتی طریقے سے بغاوت کرتے ہوئے کریمن کے سینے سے لپٹ گئی اور رونے لگی اور کہتی ''اماں کیا سچ میں عاشق مر گیا ہے؟''

اماں: ہاں بیٹی، وہ مجھ سے روز تمہارے بارے میں پوچھتا تھا میں نے ایک دن تنگ آ کر اس سے جھوٹ بولا کہ تم مر گئی ہو، وہ کمبخت تمہارا سچا عاشق تھا اس نے ایک پل بھی جینا گوارہ نہیں کیا تمہارے سوا اور وہ اسی وقت آخرت کے سفر کا مسافر بن گیا۔ اب کون اس

کی طرح تمہارے کپڑوں کے ساتھ سارا دن باتیں کریں۔؟

ماہ نور: اماں تو مجھے اس کی قبر پر تو لے چل۔

نہیں نہیں، بیٹی شیخ صاحب غصے ہوں گے۔ (اماں نے جواب دیا۔)

ماہ نور: اب جس نے جو کرنا ہے وہ کر لے، تم مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔

ماہ نور، ایک باغی جرنیل کی طرح اماں کے ساتھ قبرستان کی طرف چل دی۔ اب اس کی قبر پر کھڑے ہو کر باقی ساری داستان اس نے اماں سے سنی کہ عاشق کس طرح سے اس کو چاہتا تھا، اماں ننھے اس نے کو کال کوٹھری سے برآمد شدہ کاغذ کے ٹکڑے بھی دکھائے جن اوراق میں اس نے اس سے تخیل میں ایک عرصہ گزارا تھا۔ ماہ نور۔ اب چھوٹی بی بی نہیں رہی تھی بلکہ وہ تو اب اپنے عاشق کی قبر پر کھڑی تھی۔۔۔ (شاید اب وہ وقت آ گیا تھا کہ عاشق و معشوق یکجا ہو، محبّ و محبوب یکجا ہو۔)

ماہ نور نے پھر بھی بادشاہانہ طرز میں صاحب قبر سے کہا:

''اگر تم میرے سچے عاشق ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو تمہاری قبر کھل جائے۔''

پیرِ عشق نے سچے عاشق کی لاج رکھتے ہوئے قبر کو کھول دیا اور پھر عاشق و معشوق یکجا ہوئے، محبّ و محبوب یکجا ہوئے، ایک عاشق کو وصالِ یار نصیب ہوا، اور پھر قبر پہلے کی طرح بند ہو گئی لیکن یہ سارا ماجرا دیکھتی اماں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی۔۔۔

اندھا اعتماد

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہلکی ہلکی بارش ہر ایک کے چہرے کی اُداسی کو ختم کرتی جا رہی تھی مگر عائشہ کی اُداسی پریشانی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ عائشہ کے والد کا انتقال پانچ سال پہلے ہو گیا تھا۔ والدہ کینسر کی حالت میں پڑی رہتی ہے۔ عائشہ سب سے بڑی تھی بڑی مشکل سے عائشہ نے بی۔اے پاس کیا گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ عائشہ آگے پڑھ سکتی۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن اس سے چھوٹے تھے۔ عائشہ سکول میں نوکری کرتی بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی جو پیسے آتے اس سے گھر کا خرچہ کرتی اور اپنی ماں کا علاج ان حالات میں عائشہ کو تسلی دینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

عائشہ کے دکھوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عائشہ کبھی کبھی خود تنگ آ جاتی کہ کوئی تو ہو جس کے کندھے پر سر رکھ کے وہ روئے مگر ایسا کوئی بھی نہ ملا۔ ایک دن عائشہ رات کے وقت اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ عائشہ نے موبائل اٹھایا عائشہ نے پوچھا کون؟ کوئی لڑکا تھا۔

آ گے سے اس لڑکے نے کہا میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ جیسا کوئی نہیں۔ میں آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اتنا سب کچھ کہتے کہتے اس لڑکے نے I Love U بھی بول دیا۔

عائشہ اتنی باتیں سن کر عجیب سی کیفیت میں آ گئی اور اس لڑکے کی باتیں سنتی چلی گئی جہاں تک کہ اس لڑکے کی باتیں سنتے سنتے صبح ہو گئی اور عائشہ فون پر بات سنتی رہی۔ اس لڑکے نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ میں شام کو فون کروں گا ابھی میں آفس جانے لگا ہوں۔

عائشہ ناشتہ کیے بغیر سکول چلی گئی عائشہ آج شام ہونے کا انتظار کرنے لگی سورج نے تو اپنے وقت پر غروب ہونا تھا پر آج عائشہ نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا اور موبائل ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی آخر کار عائشہ کا انتظار ختم ہوا۔ موبائل کی گھنٹی بجی عائشہ نے پہلی بیل پر فون اٹھا لیا اور کہا کہ میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔ اس طرح عائشہ روز اپنا کام وقت سے پہلے ختم کر کے ساری رات فون پر بات کرتی۔ عائشہ نے اس لڑکے کو اپنا ہمدرد سمجھا اور اسے اپنی ہر بات بتائی ایک اچھا دوست سمجھ کر۔ اس لڑکے نے اپنا نام ہارون بتایا اور یہ بھی کہ وہ بہت امیر ہے۔ ان کے گھر تین چار نوکر ہیں، دو گاڑیاں ہیں، ساتھ ساتھ یہ بھی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ شادی کہ بعد میں تمہارے گھر کو سنبھالوں گا۔

عائشہ کو یقین نہ آئے کہ اس کا خواب پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ عائشہ نے اُسے اپنے بارے میں سب بتایا۔ اپنے گھر کا پتہ تک بھی۔ اس لڑکے نے بتایا ہم D-ground میں رہتے ہیں۔ ہمارا گھر 20,25 مرے میں ہے۔ یہ سب باتیں عائشہ کو زمین سے اونچا اڑنے میں مجبور کرتی تھی۔ عائشہ اب اپنے آپ کو کروڑ پتی سمجھتی تھی۔

پھر ایک دن اس لڑکے ہارون نے عائشہ کو بتایا وہ اسلام آباد نوکری کے لیے جا رہا ہے۔ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ پر اس لڑکے کا تعلق عائشہ کے ساتھ ویسا ہی تھا جیسا وہ اس کے پاس ہو۔ عائشہ اس لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن اس لڑکے نے عائشہ کو کہا میں جب تم سے ملوں گا تمہیں سونے کی انگوٹھی دوں گا عائشہ بہت خوش تھی۔

اچانک ایک دن ہارون کا فون آیا دوپہر میں۔ عائشہ نے فون سنا اور پوچھا کہ آج دوپہر میں فون خیریت تو ہے؟ ہارون نے بتایا کہ وہ پریشان ہے اسے پیسوں کی سخت ضرورت ہے، پر ہارون انا پرست تھا کہتا میں اپنے والدین سے نہیں مانگ سکتا۔ عائشہ نے بہت پوچھا کہ اچانک کیا ضرورت پڑ گئی پیسوں کی ہارون نے ایک لمبی کہانی سنا دی۔ عائشہ کو پہلے ہی ہارون پر اعتماد کر بیٹھی تھی یا پھر سخت محبت۔ عائشہ نے 5 منٹ بات کی اور پھر فون بند ہو گیا۔ ہارون کی پریشانی سن کر عائشہ زیادہ پریشان ہو گئی۔

عائشہ نے ہارون کو فون کیا اور کہا تمہاری اور میری پریشانی ایک ہے اور یہ بھی کہ میرے پاس 10,000 ہیں تم لے لو۔ یہ وہ پیسے تھے جو عائشہ سالوں سے جمع کرتی آ رہی تھی ایک ایک روپیہ کر کے پہلے تو ہارون نے منع کیا مگر دوسری ہی بار مان گیا اور کہا میرا ایک دوست آئے گا تمہاری طرف تم اُسے دے دینا اگلے دن عائشہ کے ہاتھ سے اس کی عمر بھر کی کمائی بھی گئی۔ عائشہ خوش تھی کہ اُس نے ہارون کی مدد کی۔

اس رات عائشہ کو ہارون کا فون نہیں آیا۔ عائشہ کو یہ تھا کہ وہ کام میں مصروف ہو گا۔ اسی طرح دو دن گزر گئے ہارون کا کوئی پتہ نہیں۔ عائشہ نے خود فون کیا مگر ہارون کا نمبر بند۔ دن دن کرتے ایک ماہ گزر گیا۔ عائشہ کو اب ہوش آیا اس نے کسی پر اندھا اعتماد کیا۔ عائشہ کے پاس ہارون کے نمبر کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ ہارون کو ڈھونڈ سکے عائشہ بہت روئی۔

مگر پھر اپنی امی اور اپنے بہن بھائیوں کی طرف دیکھ کر خود کو سنبھالا اور ہارون کو ایک برا خواب سمجھ کے بھول گئی۔

آج عائشہ دو بچوں کی ماں ہے۔ عائشہ کی ماں انتقال کر گئی ہے۔ کیونکہ ان کے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے۔ آج عائشہ اپنے گھر خوش ہے اس کے بہن بھائی بھی مگر عائشہ آج بھی خود کو اپنی ماں کے انتقال کا قصور وار سمجھتی ہے کہ اگر وہ 10,000 اس کے پاس ہوتے تو شاید اس کی ماں کا علاج ہو جاتا اور وہ ان کے ساتھ ہوتی۔ (کاش)

شاعری

انیلہ	ڈاکٹر طارق ہاشمی
مبشر سعید	ساجد رضا خان

سانحہ پشاور کی یاد میں

تجھ کو روتا چھوڑ چلا میں
ماں تیری دنیا چھوڑ چلا میں

صدمات تو کچھ اور بھی ہوں گے
پر اپنا خلا چھوڑ چلا میں
خیالات تو کچھ اور بھی ہوں گے
ماں تیری دنیا چھوڑ چلا میں

کسی ظالم کی میں گولی کھا کر
سارے لوگ جھنجھوڑ چلا میں
اپنا سب قربان کرا کر
ماں تیری دنیا چھوڑ چلا میں

درس گاہ میری مقتل بن گئی
اپنے خوابوں کو توڑ چلا میں
خون کی ندی کیسے وہاں پہ بہہ گئی
ماں تیری دنیا چھوڑ چلا میں

اب ایسے شہر میں رہنا کیا
میں اپنا رستہ جنت کو موڑ چلا
جہاں جان بھی اپنی نہیں اور باقی کیا
ماں تیری دنیا چھوڑ چلا میں

اک دن اُجالا ہو جائے گا
اس آس کو پیچھے چھوڑ چلا میں
گرد کا بادل چھٹ جائے گا
ماں تیری دنیا چھوڑ چلا میں

طارق ہاشمی

بچے کا گیت

(سانحہ ۱۶ دسمبر کے پس منظر میں)

ہو پریشاں نہ یوں میری ماں
میں ترے پاس ہوں میری ماں

خوشبوؤں میں، نواؤں میں ہوں
چار سو اِن فضاؤں میں ہوں
زندگی کی دعاؤں میں ہوں
ماں! میں تیری ہی چھاؤں میں ہوں
دُور تجھ سے گیا ہوں کہاں
ہو پریشاں نہ یوں میری ماں
میں ترے پاس ہوں میری ماں

دُور سینے سے ڈر کر لیا
کام مشکل تھا پر کر لیا
غم کی منزل کو سر کر لیا
باغِ جنت کو گھر کر لیا
اب زمیں ہے مری آسماں

ہو پریشاں نہ یوں میری ماں
میں ترے پاس ہوں میری ماں

میرا احساس قوت مری
اس وطن سے محبت مری
دیکھی دنیا نے جرأت مری
رنگ لائی شہادت مری
دل میں جذبے ہوئے ہیں جواں
ہو پریشاں نہ یوں میری ماں
میں ترے پاس ہوں میری ماں

شعبہ اردو میں ادبی نشست کا انعقاد

فیصل آباد (سٹی رپورٹر) قلم قرطاس ادبی مجلس شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی کے تحت ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کے مہمان اعزاز چنیوٹ کے ممتاز شاعر ڈاکٹر زاہد لیسین اکھیاںؔ تھے۔ تقریب میں نظامت کے فرائض حافظ محمد حیات، تلاوت حافظ ناصر اور نعت رسول مقبول ﷺ کی سعادت نائلہ یوسف نے حاصل کی۔ اس موقع پر شعبہ اردو کے اساتذہ اور ریسرچ سکالرز نے اپنے اپنے مقالے بھی پیش کیے۔ ڈاکٹر زاہد لیسین اکھیاںؔ نے اپنا کلام بھی پیش کیا اور تقریب کے اختتام پر صدر شعبہ ڈاکٹر آصف اعوان نے انہیں اعزازی شیلڈ پیش کی۔

مبشر سعید

غزل

پہنا ہے اس نے شوق سے جو پیرھن سفید
دکھنے لگا ہے اور بھی اس کا بدن سفید

تعبیر تو ذرا مجھے اس کی بتایئے
دیکھا ہے میں نے نیند میں حیرت سے تن سفید

حالت بڑی سیاہ تھی دنیا جہان کی
آنے سے کس کے ہو گئے زمین و زمن سفید

مرنے سے پہلے موت کی لذت کو جاننے
میں بھی خرید لایا ہوں اب کہ کفن سفید

گرہیں وہ کھول کھول دکھاتا رہا مجھے
کھلتا گیا لباس شکن در شکن سفید

ساجد رضا خان

(بی ایس، سیکنڈ سمسٹر)

غزل

عشق والے سلام کرتے ہیں ہم جہاں پر قیام کرتے ہیں
دشت ہے اور ہو کا عالم ہے لا تخف کا کلام کرتے ہیں
یہ محبت ہے یا جنوں میرا تیری راہوں میں شام کرتے ہیں
جانے والے ہیں اس جہاں سے ہم کچھ نہ کچھ انتظام کرتے ہیں

اَب محبت بہت ہوئی ساجدؔ
اَب کوئی اور کام کرتے ہیں

غزل

میں بھی دشت میں ڈر سکتا ہوں خود پر ماتم کر سکتا ہوں
کون بلانے آیا مجھ کو! دریا پار اُتر سکتا ہوں
نیلے پانی کے چشمے سے خالی کوزہ بھر سکتا ہوں
بجھ جائے گا ایک ستارہ میں بھی خوف سے مر سکتا ہوں

خواب میں آتے رہنا ساجدؔ
آدھی رات کو ڈر سکتا ہوں